Women Writer
Classics

افسانے

بدن کی خوشبو

عصمت چغتائی

RHOTAS LPS
Low Priced Series

بدن کی خوشبو

افسانے

عصمت چغتائی

روہتاس بکس

1992ء	اشاعت اول
نفیس پرنٹرز پٹیالہ گراؤنڈ لاہور	پرنٹرز
روہتاس بکس احمد چیمبر 5 - ٹیمپل روڈ لاہور	پبلشرز

بدن کی خوشبو

ترتیب

چھوئی موئی 5
گھونگھٹ 12
ہندوستان چھوڑ دو 17
روشن 35
کارساز 51
بدن کی خوشبو 64

چھوئی موئی

آرام کرسی ریل کے ڈبے سے لگا دی گئی اور بھائی جان نے قدم اٹھایا "الٰہی خیر!...... یا غلام دستگیر...... بارہ اماموں کا صدقہ۔ بسم اللہ بسم اللہ...... بیٹی جان سنبھل کے...... قدم تھام کے...... پائنچہ اٹھا کے...... سہج سہج' بی مغلانی نقیب کی طرح للکاریں۔ کچھ میں نے گھسیٹا کچھ بھائی صاحب نے ٹھیلا۔ تعویذوں اور امام ضامنوں کا اشتہار بنی بھائی جان تنتے ہوئے غبارے کی طرح ہانپتی سیٹ پر لڑھک بیٹھیں۔

"پاک پروردگار تیرا شکر" بی مغلانی کے منہ سے اور ہمارے دلوں سے نکلا بغیر ہاتھ پھیرہلائے ہانپ جانے کی عادت شاید وہ ساتھ لے کر تو پیدا نہ ہوئی ہوں گی اور نہ اناؤں' دایاؤں کی لاڈ بھری گودوں میں ان کا اچار پڑا۔ پھر بھی اوسط درجے کی خوبصورت دبلی پتلی لڑکی چند ہی سال میں پھپھولے کی طرح نازک بن گئی۔ بات یہ ہوئی کہ سیدھی ماں کے کولہے سے توڑ بھائی جان کے پلنگ کی زینت بنا دی گئیں اور وہاں ایک شگفتہ پھول کی طرح پڑے مہکنے کے سوا ان پر زندگی کا اور کوئی بار نہ پڑا۔ بی مغلانی شادی کے دن سے انہیں پالنے پوسنے پر مقرر کر دی گئیں۔ صبح سویرے یعنی جب بڑے لوگوں کی صبح ہوتی ہے۔ سلیچی میں منہ دھلا کر وہیں مسہری پر جوڑا بدل کر چوٹی کنگھی سولہ سنگار کر کے بھرپور دلی کے ناشتے کا خوان سامنے چن لیا جاتا

جیسے صاف کر کے میری پھولے پھولے کلوں والی بھابی ہتھیلی پر ٹھڈی رکھے بیٹھی مسکرایا کرتیں۔

لیکن یہ مسکراہٹیں شادی کے دوسرے ہی سال پھیکی پڑ گئیں اور ان کا سلسلہ ہر وقت تھوکنے اور قے کرنے میں گزرنے لگا۔ مہکتے ہوئے پھولوں میں لدی مہ پارہ کے بجائے اس روگ میں متبال بیوی کو پا کر بھائی جان بھی بدکنے لگے۔ مگر اماں بیگم اور بی مغلانی کے یہاں تو جانو بہار آ گئی۔ پہلے ہی مہینے سے گدیلے پوتڑے اس زور و شور سے سلنے لگے جانو کل ہی پرسوں میں زچگی ہونے والی ہے۔ مارے تعویذوں کے جسم پر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی، آئے دن کے ٹونے ٹوٹکے دم بولانے لگے۔ ویسے ہی بھابی جان کے دشمن کاہے کو چلنے پھرنے کے شوقین تھے۔ اب تو بس کروٹ بھی لیں تو مغلانی بی اللہ بسم اللہ کے جی جی کاروں سے گھر سر پر اٹھا لیتیں اور بس دن بھر وہ کچے گھڑے کی طرح پینٹ کر رکھی جاتیں۔ صبح شام پیر فقیر دم درود کرنے اور پھونکیں مارنے آتے۔

لیکن باوجود کہ مغلانی کا پہرہ سخت تھا، کچا گھڑا وقت سے پہلے ہی کھل گیا اور ارمانوں پر پانی پھر گیا۔ ڈال پھر خالی رہ گئی۔ بور جھڑ گیا۔ پر جان بچی لاکھوں پائے اللہ اور دے گا۔ گھر کی دولت ہے۔ اللہ نے اور دیا۔ پہرہ پہلے سے چوگنا ہو گا۔ مگر پھر ہاتھ خالی۔ تیسری دفعہ تو معاملہ پہلے سے چوگنا ہو گیا۔ مگر پھر ہاتھ خالی۔ تیسری دفعہ تو معاملہ ذرا قابل غور بن گیا۔ مارے دواؤں کے بھابی جان کا پلیتھن نکل گیا۔ رنگ ایک سرے سے غائب۔ صرف پھولی پھولی ابلی ہوئی شکر قند جیسی رہ گئیں۔ بھائی جان کی شام رات کے بارہ بجے ہونے لگی۔ بی مغلانی اور اماں بیگم کے تیور بھی ذرا چڑھنے اترنے لگے اور بھائی جان کو مسہری پر پڑے پڑے بھائی جان کی دوسری شادی کے شادیانے سنائی دینے لگے۔

اور جب اللہ اللہ کر کے پھر وہ دن آیا تو پیروں مریدوں کے علاوہ دہلی کے ڈاکٹر بھی اپنے سارے تیر تفنگ لے کر تعینات ہو گئے۔ خدا کے کرم سے انگنا مہینہ لگا اور بھابی جان صابن کے بلبلے کی طرح روئی کے پھولوں پر رکھی جانے لگیں۔ کسی

کو قریب کھڑے ہو کر چھینکنے یا ناک سنکنے کی بھی اجازت نہ تھی مبادا ردعمل سے بلبلہ شق نہ ہو جائے۔

اب ڈاکٹروں نے کہا خطرہ نکل گیا تو اماں بیگم نے بھی سوچا کہ زچگی علی گڑھ ہی میں ہو۔ ذرا سا تو سفر ہے گو بھابی جان دلی دکھی چھوڑتے لرزتی تھیں۔ جہاں کے ڈاکٹروں نے ان کا اتنا سفر صحیح و سالم کٹوا دیا تھا۔ اب آنکھوں کی سوئیاں ہی تو رہ گئی تھیں۔ دوسرے وہ زمانے کے تیور دیکھ رہی تھیں، اگر اب کے وار خالی گیا تو بھائی جان کو ان کے سینے پر سوت لانے میں کوئی بہانہ بھی آڑے نہ رہے گا اب تو وہ نام چلائے والے کی آڑ لے کر سب کچھ کر سکتے تھے۔ خبر نہیں بیچارے کو اتنا اپنا نام زندہ رکھنے اور اسے چلانے کی کیوں فکر پڑی تھی حالانکہ خود ان کا کوئی اونچا نام تھا ہی نہیں۔ دنیا میں۔ مسہری کی زینت کا جو ایک اہم فرض ہے، اگر وہ بھی نہ پورا کر سکیں تو یقیناً انہیں سکھ کی سیج چھوڑنا پڑے گی۔ یہ چند سال نوجوانی اور حسن کے بل بوتے پر وہ ڈٹی رہیں، پر اب تو ذرا تخت کے پائے ڈگمگاتے جا رہے تھے اور وہ انہیں الٹ دینے کو تیار تھا اور پھر اس تخت سے اتر کر بے چاری کے پاس دوسری جگہ کہاں تھی۔ سینا پرونا تو انہوں نے سیکھا اور نہ اس میں جی لگ دو بول پڑھے تھے، سو وہ بھی بھول بھال گئی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں اگر ان کا کوئی کھلانے پلانے والا نہ رہے تو وہ صرف ایک کام اختیار کر سکتی ہیں۔ یعنی وہی خدمت جو وہ بھائی جان کی کرتی تھیں خلق خدا کی کریں۔

لہٰذا وہ جی جان سے اس بار ایک ایسا ہتھیار مہیا کرنے پر تلی ہوئی تھیں، جس کے سہارے ان کے کھانے پہننے کا انتظام تو ہو جاتا۔ باپ نہ ہی دادا دادی تو پالیں گے ہی۔

زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ اماں بیگم کا نادر شاہی حکم آیا اور ہم لوگ یوں لدے پھندے علی گڑھ چل پڑے۔ نئے تعویذوں اور ٹوٹکوں سے لیس ہو کر بھابی جان میں بھی اتنی ہمت ہو گئی۔

"الٰہی خیر" بی مغلانی انجن کی ٹکر سے بے خبری میں دھڑام سے گریں اور

بھابی جان نے لیٹے لیٹے دونوں ہاتھوں سے گھڑا دبوچ لیا۔

"ہے ہے یہ گاڑی ہے کہ بلا چلا الٰہی پیروں کا صدقہ...... اے مشکل کشا" بی مغلانی بھابی جان کا پیٹ تھام کر بدبد کر کے درود اور کلام پاک کی آیتیں پڑھنے لگیں۔ خدا خدا کر کے غازی آباد آ گیا۔

طوفان میل کا نام بھی خوب ہے۔ دندناتی چلی جاتی ہے۔ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ڈبہ پورا اپنے لئے ریزرو تھا۔ بھیڑ بھاڑ کا خدشہ ہی نہ تھا۔ میں کھڑکی کے سامنے والی گاڑی میں بھری ہوئی مخلوق سے مطالعے میں محو اور بی مغلانی انجن کی سیٹی کے خوف سے کان بند کئے بیٹھی تھیں۔ بھابی جان کو تو دور ہی سے بھیڑ کو دیکھ کر چکر آ گیا اور وہ وہیں پڑی پر پسر گئیں۔ جوں ہی ریل رینگی، ڈبہ کا دروازہ کھلا اور ایک کنواری گھسنے لگی۔ قلی نے بہتیرا گھسیٹا، مگر وہ چلتی ریل کے پائیدان پر ڈھیٹ چھپکلی کی طرح لٹک گئی اور بی مغلانی کی "ہیں ہیں" کی پرواہ نہ کر کے اندر رینگ آئی اور غسل خانے کے دروازے سے پیٹھ لگا کر ہانپنے لگی۔

"اے ہے موئی توبہ ہے" بی مغلانی منمنائیں۔ "اے نگوڑی کیا پورے دن سے ہے۔"

"ہانپتی ہوئی بیدم عورت نے اپنے پپڑیاں جمے ہونٹوں کو بمشکل مسکراہٹ میں پھیلایا اور اثبات میں سر ہلایا۔

"اے خدا کی سنوار دیدہ تو دیکھو سردار کا..... توبہ ہے اللہ توبہ" اور وہ باری باری اپنے گالوں پر تھپڑ مارنے لگیں۔

عورت نے کچھ جواب نہ دیا صرف درد کی شدت سے تڑپ کر غسل خانے کا دروازہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ سانس اور بے ترتیب ہو گیا اور پیشانی پر پسینے کے قطرے ٹھنڈی مٹی پر اوس کی بوندوں کی طرح پھوٹ آئے۔

"اری کیا پہلوٹھی کا ہے؟" بی مغلانی نے اس کے الھڑپن سے خوفزدہ ہو کر کہا اور اس بار کرب کا ایسا حملہ پڑا کہ وہ جواب ہی نہ دے سکی۔ اس کے چہرے کی ساری رگیں کھنچنے لگیں، لمبے لمبے آنسو اس کی ابلی ہوئی آنکھوں سے پھوٹ نکلے۔

بی مغلانی ہے ہے 'اوئی' ہائے' کرتی رہیں اور وہ درد کی لہر کو گھونٹتی رہی۔ میں بسور رہی تھی اور بھابی جان سسکیاں لے رہی تھیں۔

"اے ہے بی گنواری کیا مزے سے بیٹھی دیکھ رہی ہو۔ اے بیٹی ادھر منہ کر کے بیٹھو" اور گنواری نے جلدی سے منہ ادھر کر لیا۔ پھر جوں ہی درد کی لہر سے تڑپ کر اس نے آواز نکالی' گردن قابو میں نہ رہ سکی' اور بی مغلانی نے صلواتیں سنانی شروع کیں۔ "اونہ توبہ جیسے ایک بچے کو دنیا میں داخل ہوتے دیکھ کر میرا کنوارپن مٹ ہی تو جائے گا۔" بھابی جان دوپٹہ منہ پر لپیٹے بسور رہی تھیں۔ بی مغلانی ناک پر برقعہ رکھے خی خی تھوک رہی تھیں اور ریل کے فرش کی جان کو رو رہی تھی۔

ایک دم ایسا معلوم ہوا ساری دنیا سکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ فضا گھٹ کر ٹیڑھی میڑھی ہو گئی۔ شدت احساس سے میری کنپٹیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح اکڑ گئیں اور بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ میں نے سوچا عورت اب مری اور اب مری کہ ایک دم سے فضا کا تشنج رک گیا۔ بی مغلانی کی ناک کا برقعہ پھسل پڑا اور بالکل بھابی جان کی سلیم شاہی جوتیوں کے پاس لال لال گوشت کی بوٹی آن پڑی۔ حیرت اور مسرت کی ملی جلی چیخ میرے منہ سے نکلی اور جھک کر اس ننھی سی کائنات کو دیکھنے لگی جس نے اپنا لمبا چوڑا دہانہ کھول کر ہائے توبہ ڈال دی۔

بی مغلانی نے میری چوٹی پکڑ کر مجھے کونے میں ٹھونس دیا اور اس عورت پر گالیوں اور ملامتوں کا طومار لے کر ٹوٹ پڑیں۔ میں نے سیٹ کے کونے سے آنسوؤں کی چلمن سے جھانک کر دیکھا تو وہ عورت مری نہ تھی۔ بلکہ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹ جنہیں اس نے چبا ڈالا تھا۔ آہستہ آہستہ مسکراہٹ میں پھیل رہے تھے۔ اس نے ننھے سے سائل کی واویلا سے بے چین ہو کر آنکھیں کھول دی۔ آڑی ہو کر اس نے اسے اٹھا لیا۔ کچھ دیر وہ اپنے ناتجربہ کار ہاتھوں سے اسے صاف کرتی رہی۔ پھر اس نے اوڑھنی سے دھجی پھاڑ کر نال کو کس کر باندھ دیا۔ اس کے بعد وہ بے کسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ مجھے اپنی طرف مخاطب دیکھ کر وہ ایک دم

کھل کھلا کر ہنس پڑی "کوئی چھری چکو ہے بی بی جی؟"

بی مغلانی گالیاں دیتی رہ گئیں۔ بھابی جان نے بسور کر میرا آنچل کھینچا پر میں نے ناخون کاٹنے کی قینچی اسے پکڑا دی۔

اس کا سن میرے ہی اتنا ہو گا یا شائد سال چھ مہینے بڑی ہو۔ وہ اپنے الھڑ، ناتجربہ کار ہاتھوں سے ایک بچہ کا نال کاٹ رہی تھی جو اس نے چند منٹ پیشتر جنا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے وہ بھیڑ بکریاں یاد آنے لگیں جو بغیر دائی اور لیڈی ڈاکٹر کی مدد کے گھاس چرتے چرتے پیڑ تلے زچہ خانہ رما لیتی ہیں اور نوزائیدہ کو چاٹ چاٹ کر قصہ ختم کرتی ہیں۔

بزرگ لوگ کنواری لڑکیوں کو بچہ کی پیدائش دیکھنے سے منع کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ زیب النساء نے اپنی بہن کے ہاں بچہ پیدا ہوتے دیکھ لیا تھا تو وہ ایسی ہیبت زدہ ہوئی کہ ساری عمر شادی ہی نہ کی۔ شائد زیب النساء کی بہن میری بھابی جان جیسی ہو گی، ورنہ اگر وہ اس فقیرنی کے بچہ پیدا ہوتے دیکھ لیتی تو میری ہی ہم خیال ہو جاتی کہ سب ڈھونگ رچاتے ہیں۔ بچہ پیدا کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا بھابی جان کے لئے ریل پر سوار ہونا یا اترنا۔

اور مجھے تو ایسی بھیانک قسم کی شرم کی بات بھی نہ معلوم ہوئی۔ اس سے کہیں زیادہ بے ہودہ باتیں بی مغلانی اور اماں ہر وقت مختلف عورتوں کے بارے میں کیا کرتی تھیں جو میرے کچے کانوں میں جا کر بھنے چنوں کی طرح پھوٹا کرتی تھیں۔

تھوڑی دیر تو وہ پھوہڑپن سے بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کرتی رہی۔ آنسو خشک ہو چکے تھے اور وہ کبھی کبھی ہنس رہی تھی جیسے اسے کوئی گد گدا رہا ہو۔ پھر بی مغلانی کے ڈانٹنے پر وہ سہم گئی اور بچے کو چیتھڑوں میں لپیٹ کر الگ سیٹ کے نیچے رکھ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ بھابی جان کی چیخ نکل گئی۔

اتنے میں بی مغلانی بھابی جان کو ٹٹولتی سہلاتی رہیں۔ اس نے باتھ روم سے پانی لا کر ڈبہ کو صاف کرنا شروع کیا۔ بھابی جان کی زرکار سلیم شاہی دھو پونچھ کر کونے سے لگا کر کھڑی کر دی۔ پھر اس نے پانی اور چیتھڑوں کی مدد سے ڈبہ سے

جملہ زچگی کے نشانات دور کر ڈالے۔ اتنے میں ہم تینوں مقدس بی بیاں سیٹوں پر لدی احمقوں کی طرح اسے دیکھتی رہیں۔ اس کے بعد وہ بچہ کو چھاتی سے لگا کر باتھ روم کے دروازے کے سہارے ہو بیٹھی جیسے کوئی گھر کا معمولی کام کاج کر کے جی بہلانے فرصت سے بیٹھ جائے اور چنے چباتے چباتے اونگھ گئی۔

پر گاڑی کے دھچکے سے وہ چونک پڑی۔ گاڑی رکتے رکتے اس نے ڈبے کا دروازہ کھولا اور پیر تولتی اتر گئی۔

ٹکٹ چیکر نے پوچھا "کیوں ری ٹکٹ؟" اور اس نے مسرت سے بے تاب ہو کر جھولی پھیلا دی جیسے وہ کہیں سے جھڑبیری کے بیر چرا کر لائی ہو۔ ٹکٹ چیکر منہ پھاڑے کھڑا رہ گیا۔ اور وہ ہنستی پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی بھیڑ میں گم ہو گئی۔

"خدا کی سنوار ان خانگیوں کی صورت پر۔ یہ حرامی حلالی جنتی پھرتی ہیں موئی جادوگرنیاں" بی مغلانی بڑبڑائیں۔ ریل نے ٹھوکر لی اور چل پڑی۔

بھابی جان کی سسکیاں ایک منظم چیخ میں ابھر آئیں "ہے ہے مولا خیر ہے بیگم دلہن!" بی ملغانی ان کا متغیر چہرہ دیکھ کر لرزیں۔

اور وہاں خیر غائب تھی!

اور بھابی جان کے ہونق چہرے پر بھائی جان کی دوسری شادی کے تاشے باجے خزاں برسانے لگے۔

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

نئی روح دنیا میں قدم رکھتے جھجک گئی اور منہ بسور کر لوٹ گئی۔ میری ننھی پھلا رانی نے جو طلسم ہوش رُبا قسم کی زچگی دیکھی تو مارے ہیبت کے حمل گر گیا۔

گھونگھٹ

سفید چاندنی بچھے تخت پر بگلے کے پروں سے زیادہ سفید بالوں والی دادی بالکل سنگ مرمر کا بھدا سا ڈھیر معلوم ہوتی تھیں۔ جیسے ان کے جسم میں خون کی ایک بوند نہ ہو۔ ان کی ہلکی سرمئی آنکھوں کی پتلیوں تک پر سفیدی رینگ آئی تھی اور جب وہ اپنی بے نور آنکھیں کھولتیں تو ایسا معلوم ہوتا۔ سب روزن بند ہیں۔ کھڑکیاں دبیز پردوں کے پیچھے سہمی چھپی بیٹھی ہیں۔ انہیں دیکھ کر آنکھیں چوندھیانے لگتی تھیں جیسے ارد گرد پسی ہوئی چاندی کا غبار معلق ہو۔ سفید چنگاریاں سی پھوٹ رہی ہوں۔ ان کے چہرے پر پاکیزگی اور دوشیزگی کا نور تھا۔ اسّی برس کی اس کنواری کو کبھی کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

جب وہ تیرہ چودہ برس کی تھی تو بالکل پھولوں کا گچھا لگتی تھیں۔ کمر سے نیچے جھولتے ہوئے سنہری بال اور میدہ شہاب رنگت۔ شباب زمانہ کی گردش نے چوس لیا صرف میدہ رہ گیا ہے۔ ان کے حسن کا ایسا شہرہ تھا کہ اماں باوا کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ ڈرتے تھے کہیں انہیں جنات نہ اڑا کے لے جائیں کیونکہ وہ اس دھرتی کی مخلوق نہیں لگتی تھی۔

پھر ان کی منگنی ہماری اماں کے ماموں سے ہو گئی۔ جتنی دلہن گوری تھی اتنے ہی دولھا میاں سیاہ بھٹ تھے۔ رنگت کو چھوڑ کر حسن و مردانگی کا نمونہ تھے کیا ڈسی ہوئی پھٹارا آنکھیں تلوار کی دھار جیسی کھڑی ناک اور موتیوں کو ماند کرنے والے دانت مگر اپنی رنگت کی سیاہی سے بے طرح جزتے تھے۔

جب منگنی ہوئی تو سب نے خوب چھیڑا۔

"ہائے دولہا ہاتھ لگائے گا تو دلہن میلی ہو جائے گی۔"

"چاند کو جانو گرہن لگ جائے گا۔"

کالے میاں اس وقت سترہ برس کے خود سر بگڑے دل بچھڑے تھے۔ ان پر دلہن کے حسن کی کچھ ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ رات ہی رات جودھ پور اپنے نانا کے ہاں بھاگ گئے۔ دبی زبان سے اپنے ہم عمروں سے کہا "میں شادی نہیں کروں گا۔" یہ وہ زمانہ تھا جب چوں چرا کرنے والوں کو جوتے سے درست کر لیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ منگنی ہو جائے تو پھر توڑنے کی مجال نہیں تھی۔ ناکیں کٹ جانے کا خدشہ ہوتا تھا۔

اور پھر دلہن میں عیب کیا تھا؟ یہی کہ وہ بے انتہا حسین تھی۔ دنیا حسن کی دیوانی ہے اور آپ حسن سے نالاں بد مزاقی کی حد۔

"وہ مغرور ہے۔" دبی زبان سے کہا۔

"کیسے معلوم ہوا؟"

جب کہ کوئی ثبوت نہیں مگر حسن ظاہر ہے۔ مغرور ہوتا ہے اور کالے میاں کسی کا غرور جھیل جائیں یہ ناممکن۔ ناک پر مکھی بٹھانے کے روادار نہ تھے۔

بہت سمجھایا کہ میاں وہ تمہارے نکاح میں آنے کے بعد تمہاری ملکیت ہو گی۔ تمہارے حکم سے دن کو رات اور رات کو دن کہے گی۔ جدھر بٹھاؤ گے بیٹھے گی اٹھاؤ گے اٹھے گی۔

کچھ جوتے بھی پڑے اور آخر کار کالے میاں کو پکڑ بلایا گیا اور شادی کر دی گئی۔

ڈومنیوں نے کوئی گیت گا دیا۔ کچھ گوری دلہن اور کالے دولہا کا۔ اس پر کالے میاں پھنپھنا اٹھے۔ اوپر سے کسی نے چبھتا ہوا ایک سہرا پڑھ دیا۔ پھر تو بالکل ہی الف ہو گئے۔ مگر کسی نے ان کے طنطنہ کو سنجیدگی سے نہ لیا۔ مذاق ہی سمجھتے رہے اور چھیڑتے رہے۔

دولہا میاں شمشیر برہنہ بنے جب دلہن کے کمرے میں پہنچے تو لال لال چمکدار

پھولوں میں الجھی سلجھی دلہن دیکھ کر پسینے چھوٹ گئے۔ اس کے سفید ریشمی ہاتھ دیکھ کر خون سوار ہو گیا۔ جی چاہا اپنی سیاہی اس سفیدی میں ایسی گھوٹ ڈالیں کہ امتیاز ہی ختم ہو جائے۔

کانپتے ہاتھوں سے گھونگھٹ اٹھانے لگے تو دلہن بالکل اوندھی ہو گئی۔

"اچھا تم خود ہی گھونگھٹ اٹھا دو۔"

دلہن اور نیچے جھک گئی۔

"ہم کہتے ہیں۔ گھونگھٹ اٹھاؤ۔" ڈپٹ کر بولے۔

دلہن بالکل گیند بن گئی۔

"اچھا جی اتنا غرور!" دولھا نے جوتے اتار کر بغل میں دبائے اور پائیں باغ والی کھڑکی سے کود کر سیدھے اسٹیشن، پھر جودھ پور!

اس زمانے میں طلاق ولاق کا فیشن نہیں چلا تھا۔ شادی ہو جاتی تھی۔ تو بس ہو ہی جاتی تھی۔ کالے میاں سات برس گھر سے غائب رہے۔ دلہن سسرال اور میکہ کے درمیان معلق رہیں۔ ماں کو روپیہ پیسہ بھیجتے رہے گھر کی عورتوں کو پتہ تھا کہ دلہن "ان چھوئی" رہ گئی۔ ہوتے ہوتے مردوں تک بات پہنچی۔ کالے میاں سے پوچھ گچھ کی گئی۔

"وہ مغرور ہے۔"

"کیسے معلوم؟"

"ہم نے کہا گھونگٹ اٹھاؤ، نہیں سنا۔"

"عجب گاؤدی ہوا میاں کہیں دلھن خود گھونٹ اٹھاتی ہے۔ تم نے اٹھایا ہوتا۔"

"ہرگز نہیں، میں نے قسم کھائی ہے۔ وہ خود گھونگھٹ نہیں اٹھائے گی تو چولھے میں جائے۔"

"اماں عجب نامرد ہو۔ دلھن سے گھونگھٹ اٹھانے کو کہتے ہو۔ پھر کہو گے وہ آگے بھی پیش قدمی کرے اجی لاحول ولا قوۃ۔"

گوری بی کے ماں باپ اکلوتی بیٹی کے غم میں گھلنے لگے۔ بچی میں کیا عیب تھا کہ دولہا نے ہاتھ نہ لگایا۔ ایسا اندھیر تو نہ دیکھا نہ سنا۔

کالے میاں نے اپنی مردانگی کے ثبوت میں رنڈی بازی' لونڈے بازی' مرغ بازی' کبوتر بازی غرض کوئی بازی نہ چھوڑی اور گوری بی گھونگھٹ میں سلگتی رہیں۔

نانی اماں کی حالت خراب ہوئی تو سات برس بعد کالے میاں گھر لوٹے اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر پھر بیوی سے ان کا ملاپ کرانے کی کوشش کی گئی۔ پھر سے گوری بی دلہن بنائی گئیں۔ مگر کالے میاں نے کہہ دیا۔ "اپنی ماں کی قسم کھا چکا ہوں گھونگٹ میں نہیں اٹھاؤں گا۔"

سب نے گوری بی کو سمجھایا۔ دیکھو بنو ساری عمر کا بھگتان ہے۔ شرم و حیا کو رکھو طاق میں اور جی کڑا کر کے تم آپ ہی گھونگٹ اٹھا دینا۔ اس میں کچھ بے شرمی نہیں وہ تمہارا شوہر ہے۔ خدائے مجازی ہے۔ اس کی فرمانبرداری تمہارا فرض ہے۔ تمہاری نجات اس کا حکم ماننے ہی میں ہے۔"

"پھر سے دلہن بجی سیج سجائی پلاؤ زردہ پکا اور دولھا میاں دلہن کے کمرے میں دھکیلے گئے۔ گوری بی اب اکیس برس کی نوخیز حسینہ تھیں۔ انگ انگ سے جوانی پھوٹ رہی تھی۔ آنکھیں بوجھل تھیں۔ سانسیں بھری تھیں۔ سات برس انہوں نے اسی گھڑی کے خواب دیکھ کر گزارے تھے۔ ہم سن لڑکیوں نے بیسیوں راز بتا کر دل کو دھڑکنا سکھا دیا تھا۔ دلہن کے حنا آلودہ ہاتھ پیر دیکھ کر کالے میاں کے سر پر جن منڈلانے لگے۔ ان کے سامنے ان کی دلہن رکھی تھی۔ چودہ برس کی کچی کلی نہیں ایک مکمل گلدستہ رال ٹپکنے لگی۔ آج ضرور دن اور رات مل کر سرمگیں شام کا سماں بندھے گا۔ ان کا تجربہ کار جسم شکاری چیتے کی طرح منہ زور ہو رہا تھا۔ انہوں نے اب تک دلہن کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ بدکاریوں میں بھی اس رس بھری دلہن کا تصور دل پر آرے چلاتا رہا تھا۔

"گھونگٹ اٹھاؤ۔" انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں حکم دیا۔

دلہن کی چھنگلی بھی نہ ہلی۔

"گھونگٹ اٹھاؤ۔" انہوں نے بڑی لجاجت سے رونی آواز میں کہا۔

سکوت طاری ہے۔

"اگر میرا حکم نہیں مانو گی تو پھر منہ نہیں دکھاؤں گا۔"

دلہن ٹس سے مس نہ ہوئی۔

کالے میاں نے گھونسہ مار کر کھڑکی کھولی اور پائیں باغ میں کود گئے۔

اس رات کے گئے وہ پھر واپس نہ لوٹے۔

ان چھوئی گوری بی تیس سال تک ان کا انتظار کرتی رہیں۔ سب مر کھپ گئے۔ ایک بوڑھی خالہ کے ساتھ فتح پور سیکری میں رہتی تھیں کہ سناؤنی آئی دولھا آئے ہیں۔

دولھا میاں موریوں میں لوٹ پیٹ کر امراض کا پلندہ بنے آخری دم وطن لوٹے۔ دم توڑنے سے پہلے انہوں نے التجا کی کہ گوری بی سے کہو آجاؤ کہ دم نکل جائے۔

گوری بی کھنبہ سے ماتھا نکائے کھڑی رہیں۔ پھر انہوں نے صندوق کھول کر اپنا تار تار شہانہ جوڑا نکالا۔ آدھے سفید سر میں سہاگ کا تیل ڈالا اور گھونگٹ سنبھالتی لب دم مریض کے سرہانے پہنچیں۔

"گھونگٹ اٹھاؤ۔" کالے میاں نے نزع کے عالم میں سسکی بھری۔

گوری بی کے لرزتے ہوئے ہاتھ گھونگٹ تک اٹھے اور نیچے گر گئے۔

کالے میاں دم توڑ چکے تھے۔

انہوں نے وہیں اکڑوں بیٹھ کر پلنگ کے پائے پر چوڑیاں توڑیں اور گھونگٹ کی بجائے سر پر رنڈاپے کا سفید دوپٹہ کھینچ لیا۔

ہندوستان چھوڑ دو

"صاب مر گیا۔" جینت رام نے بازار سے سودے کے ساتھ یہ خبر لا کر دی------

"صاحب! کون صاحب؟"

"وہ کانڑیا صاحب تھا نا۔"

"اوہ کانا صاحب۔ جیکسن۔ چہ بے چارا۔" میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ کائی لگی پرانی جگہ جگہ سے کھونڈی بتیسی کی طرح منہدم ہوتی ہوئی دیوار کے اس پار ادھڑے ہوئے سیمنٹ کے چبوترے پر سکھوبائی پیر پسارے بھی مراہٹی زبان میں بین کر رہی تھی۔ اس کے پاس پڈا کڑوں بیٹھا ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ پڈو یعنی پیٹر کالے گورے میل کا نادر نمونہ تھا اس کی آنکھیں جیکسن صاحب کی طرح نیلی اور بال بھورے تھے۔ رنگ گندمی تھا جو دھوپ میں جل کر بالکل تانبے جیسا ہو گیا تھا۔

اسی کھڑکی میں سے میں برسوں سے ایک عجیب و غریب خاندان کو دیکھتی آئی ہوں۔ یہیں بیٹھ کر میری جیکسن سے پہلی مرتبہ بات چیت ہوئی تھی۔ سن بیالیس کا "ہندوستان چھوڑ دو" کا ہنگامہ زوروں پر تھا۔ گرانٹ روڈ سے داور تک کا سفر ملک کی بے چینی کا ایک مختصر مگر جاندار نمونہ ثابت ہوا تھا۔ منگٹن روڈ کے ناکے پر ایک بڑا الاؤ جل رہا تھا۔ جس میں راہ چلتوں کی ٹائیاں ہیٹ اور کبھی موڑ آ جاتا تو پتلونیں اتار کر جلائی جا رہی تھیں۔ سین کچھ بچگانہ سہی مگر دلچسپ تھا۔ لچھے دار ٹائیاں نئے طرح دار ہیٹ' استری کی ہوئی پتلونیں بڑی بے دردی سے آگ میں

جھونکی جا رہی تھیں۔ پھٹے چیتھڑے پہنے آتش باز نئے نئے کپڑوں کی نہایت بے تکلفی سے آگ میں جھونک رہے تھے۔ ایک لمحے کو بھی تو کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آ رہا تھا کہ نئی گیبرڈین کی پتلون کو آگ کے منہ میں جھونکنے کے بجائے اپنی ننگی سیاہ ٹانگوں پر ہی چڑھا لے۔

اتنے میں ملٹری ٹرک آ گئی تھی جس میں سے لال بھبوکا تھو تھنیوں والے گورے ہاتھوں میں مشین گنیں سنبھالے دھما دھم کودنے لگے۔ مجمع ایک دم پھر سے نہ جانے کہاں اڑ گیا تھا۔ میں نے یہ تماشا میونسپل دفتر کے محفوظ احاطے سے دیکھا تھا اور مشین گنیں دیکھ کر میں جلدی سے اپنے دفتر میں گھس گئی تھی۔

ریل کے ڈبوں میں بھی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ بمبئی سنٹرل سے جب ریل چلی تھی تو ڈبہ کی آٹھ سیٹوں میں سے صرف تین سلامت تھیں۔ لوئر پریل تک وہ تینوں بھی اکھیڑ کر کھڑکیوں سے باہر پھینک دی گئیں۔ اور میں راستہ بھر کھڑی دادر آئی۔ مجھے ان چھوکروں پر قطعی کوئی غصہ نہیں آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا یہ ساری ریلیں' یہ ٹائیاں' پتلونیں ہماری نہیں دشمن کی ہیں۔ ان کے ساتھ ہم دشمن کو بھی بھون رہے ہیں۔ اٹھا کر پھینک رہے ہیں۔ میرے گھر کے قریب ہی سڑک کے بیچوں بیچ ٹریفک روکنے کے لئے ایک پیڑ کا لمبا سا گدھا سڑک پر لمبا لمبا ڈال کر اس پر کوڑے کرکٹ کی اچھی خاصی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ میں بمشکل اسے پھلانگ کر اپنے فلیٹ کے دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ ملٹری ٹرگ آ گئی۔ اور جو پہلا گورا مشین گن لئے دھم سے کودا تھا۔ وہ جیکسن صاحب ہی تھا۔ ٹرک کی آمد کی خبر سنتے ہی سڑک پر روک باندھنے والا دستہ ادھر ادھر بلڈنگوں پر سٹک گیا تھا۔

میرا فلیٹ چونکہ سب سے نچلی منزل پر تھا لہٰذا بہت سے چھوکرے ایک دم ریلا کر کے گھس آئے۔ کچھ باورچی خانہ میں گھس گئے۔ کچھ غسل خانہ اور سنڈاس میں دبک گئے۔

چونکہ میرا دروازہ کھلا تھا اس لئے جیکسن معہ دو مسلح گوروں کے مجھ سے جواب طلب کرنے آگے آیا۔

"تمہارے گھر میں بدمعاش چھپے ہیں انہیں ہمارے سپرد کرو۔"

"میرے گھر میں تو کوئی نہیں۔ صرف میرے نوکر ہیں۔" میں نے بڑی لاپرواہی سے کہا۔

"کون ہیں تمہارے نوکر؟"

"یہ تینوں-----" میں نے تین آدمیوں کی طرف اشارہ کیا جو برتن کھڑپٹر کر رہے تھے۔

"غسل خانہ میں کون ہے؟"

"میری ساس نہا رہی ہیں۔" میری ساس نہ جانے اس وقت کہاں ہوں گی۔"

"اور پاخانہ میں۔" اس کے چہرے پر کچھ شرارت کی جھلکی آئی۔

"میری ماں ہوں گی یا شاید بہن ہو۔ مجھے کیا پتہ میں تو ابھی باہر سے آئی ہوں۔"

"پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا غسل خانہ میں تمہاری ساس ہے؟"

"میں داخل ہوئی تو انہوں نے آواز دے کر تولیہ مانگا تھا۔"

"ہوں----- اچھا اپنی ساس سے کہ دو سڑک روکنا جرم ہے!" اس نے دبی آواز میں کہا اور اپنے ساتھیوں کو جنہیں وہ باہر کھڑا کر آیا تھا واپس ٹرک میں جانے کو کہا۔

"ہوں-----! ہوں ہوں۔" وہ گردن ہلا کر مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں پرمعنی جگنو چمک رہے تھے۔

جیکسن کا بنگلہ میرے احاطے سے ملحقہ زمین پر تھا۔ مغربی رخ پر سمندر تھا۔ اس کی میم صاحب مع دو بچوں کے ان دنوں ہندوستان آئی ہوئی تھی۔ بڑی لڑکی جوان تھی اور چھوٹی بارہ تیرہ برس کی۔ میم صاحب صرف چھٹیوں میں تھوڑے دنوں کے لئے ہندوستان آجاتی تھی۔ اس کے آتے ہی بنگلہ کا حلیہ بدل جایا کرتا تھا۔ نوکر چاق و چوبند ہو جاتے۔ اندر باہر تپائی جاتی۔ باغ میں نئے گملے مہیا کئے جاتے۔ جو

میم صاحب کے جاتے ہی پاس پڑوس کے لوگ چرانا شروع کر دیتے۔ کچھ مالی بیچ ڈالتا اور دوبارہ جب میم صاحب کی آمد کا غلغلہ مچتا تو صاحب پھر وکٹوریہ گارڈن سے گملے اٹھوا لاتا۔ جتنے دن میم صاحب رہتی نوکر باوردی نظر آتے، صاحب بھی یونیفارم ڈاٹے رہتا یا نہایت عمدہ ڈریسنگ گاؤن پہنے صاف ستھرے کتوں کے ساتھ پھولوں کا بالکل اس طرح معائنہ کرتا پھرتا گویا وہ سو فی صد صاحب لوگوں میں سے ہے۔ مگر میم صاحب کے جاتے ہی وہ اطمینان کی سانس لے کر دفتر جاتا ڈیوٹی کے بعد نیکر اور بنیان پہنے چبوترے پر کرسی ڈالے بیئر پیا کرتا اور شاید اس کا ڈریسنگ گاؤن اس کا بیرا چرا لے جاتا۔ کتے تو میم صاحب کے ساتھ ہی چلے جاتے۔ دو چار ٹیری کتے بنگلے کو یتیم سمجھ کر احاطے میں ڈیرہ ڈال دیتے۔

میم صاحب جتنے دن رہتی ڈنر پارٹیوں کا زور رہتا۔ اور وہ صبح ہی صبح پنچم سروں میں اپنی آیا کو آواز دیتی۔۔۔۔۔ "آیو۔ ودو!"

"جی میم صاحب!" آیا اس کی آواز پر تڑپ کر دوڑتی۔ مگر جب میم صاحب چلی جاتی تو لوگوں کا کہنا تھا بیگم بن بیٹھتی تھی۔ وہ اس کی غیر حاضری میں غیوضی بھگتایا کرتی تھی۔ فلومینا اور پڑوا اسی عارضی راج کے مستقل ثبوت تھے۔

"کچھ ہندوستان چھوڑ دو۔" کا ہنگامہ اور کچھ میم صاحب اکتا گئی تھی۔ اس گندے پچپچاتے ملک اور اس کے باسیوں سے۔ اس لئے وہ جلد ہی وطن سدھار گئی۔ انہیں دنوں پھر میری ملاقات جیکسن سے اسی کھڑکی کے ذریعہ ہوئی۔تمہارا اماس نہا چکا... اس نے بمبئی کی زبان میں بدذاتی سے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں صاحب۔۔۔۔۔ نہا چکا۔۔۔۔۔ خون کا غسل کیا اس نے!" میں نے تلخی سے کہا۔ چودہ چودہ برس کے چند بچے کچھ ہی دن پہلے ہری نواس پر جو گولی چلی تھی۔ اس میں مارے گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ان میں کچھ وہی بچے ہوں گے جو اس دن جب ٹرک آ گئی تھی تو میرے گھر میں چھپ گئے تھے۔ مجھے صاحب سے گھن آنے لگی تھی۔ برٹش سامراج کا جیتا جاگتا ہتھیار میرے سامنے کھڑا ان بے گناہوں کے خون کا مذاق اڑا رہا تھا جو اس کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ میرا جی

چاہا اس کا منہ نوچ لوں اس کی کون سی آنکھ شیشے کی تھی۔ یہ اندازہ لگانا میرے لئے مشکل تھا کیونکہ وہ شیشے والی آنکھ ولایتی فنکاری کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ اس میں ساری جیکسن کی سفید قوم کی چالبازی بھری ہوئی تھی۔ احساسِ برتری کا زہر دونوں ہی آنکھوں میں برابر رچا ہوا تھا۔ میں نے دھڑ سے کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے۔

مجھے سکھوبائی پر غصہ آتا تھا۔ سور کی بچی سفید قوم کے ذلیل کتے کا تر نوالہ بنی ہوئی تھی۔ کیا خود اس ملک کے کوڑھیوں اور حرامزادوں کی کمی تھی۔ جو وہ ملک کی غیرت کے نیلام پر تل گئی تھی ہر روز جیکسن شراب پی کر اس کی ٹھکائی کرتا۔ ملک میں بڑے بڑے معرکے سر کیئے جا رہے تھے۔ سفید حاکم بس چار دنوں کے مہمان تھے۔

"بس اب چل چلاؤ ہے ان کی حکومت کا۔" کچھ لوگ کہتے۔

"اجی یہ شیخ چلی کے خواب ہیں۔ انہیں نکالنا مذاق نہیں۔" دوسرے لوگ کہتے اور میں ملک کے نیتاؤں کی لمبی چوڑی تقریریں سن کر سوچتی۔ "کوئی جیکسن کانے صاحب کا ذکر ہی نہیں کرتا۔ وہ مزے سے سکھوبائی کے جھونٹے پکڑ کر پیٹتا ہے۔ فلومینا اور پٹو کو مارتا ہے۔ جے ہند کے نعرے لگانے والے اس کم بخت کا کچھ فیصلہ کیوں نہیں کرتے۔"

مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ پچھواڑے شراب بنتی تھی۔ مجھے معلوم تھا۔ سب کچھ مگر میں کیا کر سکتی تھی۔ سنا تھا کہ اگر ان غنڈوں کی رپورٹ کر دو۔ تو یہ جان کے لاگو ہو جاتے ہیں۔ ویسے مجھے یہ بھی تو نہیں معلوم تھا کہ کس سے رپورٹ کروں۔ ساری بلڈنگ کے نل دن رات ٹپکتے تھے۔ موریاں سڑ رہی تھیں۔ مگر مجھے قطعی نہیں معلوم تھا کہ کہاں اور کس سے رپورٹ کی جاتی ہے۔ آس پاس رہنے والوں میں بھی کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اگر کوئی بذات عورت اوپر سے سر پر کوڑے کا ٹین الٹ دے تو اس کی کس سے شکایت کرو۔ ایسے موقعوں پر عموماً" جس کے سر پر کوڑا گرتا وہ منہ اونچا کر کے کھڑکیوں کو گالیاں دیتا کپڑے جھاڑتا اپنی راہ لیتا۔

میں نے موقع پا کر ایک دن سکھوبائی کو پکڑا۔

"کیوں کم بخت! یہ پاجی تمہیں روز پیٹتا ہے تجھے شرم بھی نہیں آتی۔"

"روج کبھی مارتا بائی؟" وہ بحث کرنے لگی۔

"خیر وہ مہینے میں چار پانچ دفعہ تو مارتا ہے نا!"

"ہاں مارتا ہے بائی ـــــــ سو ہم بھی سالے کو مارتا ہے۔" وہ ہنسی۔

"چل جھوٹی۔"

"ارے پٹو کا سوگند ـــــــ ہم تھوڑا مار دیا سالا کو پرسوں؟"

"مگر تجھے شرم نہیں آتی' یہ سفید چمڑی والے کی جوتیاں سہتی ہے؟" میں نے ایک سچے وطن پرست کی طرح جوش میں آ کر لکچر دے ڈالا۔ "ان لٹیروں نے ہمارے ملک کو کتنا لوٹا ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

"ارے بائی کیا بات کرتا تم۔ صاب سالا کوئی کو نہیں لوٹا۔ یہ جو موالی لوگ ہے نا یہ بیچارا کو دن رات لوٹتا۔ میم صاحب گیا۔ پیچھے سب کٹلری بھنڈی بیرا لوگ پار کر دیا۔ اکھا پاٹلوں کوٹ ہیٹ' اتنا فسٹ کلاس جوتا ـــــــ سب کھتم ـــــــ دیکھو چل کے بنگلے میں کوچھ بھی نئیں چھوڑا۔ تم کہتا ہے چور ہے صاب' ہم بولتا ہم نئیں ہووے تو سالا اس کا بوٹی کاٹ کے جاوے اے لوگ۔"

"مگر تمہیں کیوں اس کا اتنا درد ہے؟"

"کائیکو نئیں ہووے درد وہ ہمارا مرد ہے نا بائی ـــــــ سکھو بائی مسکرائی۔

"اور میم صاحب؟"

"میم صاب سالی پکی چھنال ہاں ـــــــ !" سکھوبائی نے فیصلہ کیا۔ "ہم اس کو اچھی طرح جانتا ـــــــ ہاں ـــــــ لندین میں اس بوت تار ہے۔" یہاں سکھو بائی نے موٹی سی گالی دے کر کہا۔ "وہیں مری رہتی ہے۔ آتی بھی نئیں' پن آتی تو اکھا دن صاحب سے کھٹ کھٹ۔ نوکر لوگ سے کھٹ کھٹ۔"

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اب انگریز ہندوستان سے جا رہے ہیں۔ صاب بھی چلا جائے گا۔ مگر وہ قطعی نہیں سمجھی۔ یہی کہتی رہی۔"

"صاب ہم کو چھوڑ کے کیا جائے گا----- بائی اس کو ہلایت ایک دم پسند نہیں۔"

کچھ سال کے لئے مجھے پونا رہنا پڑا۔ اس عرصے میں دنیا بدل گئی۔ پھر واقعی انگریز چلے گئے۔ ملک کا بٹوارہ ہوا۔ سفید حاکم پٹی ہوئی چال چل گیا اور ملک خون کی لہروں میں نہا گیا۔

جب بمبئی واپس آئی تو بنگلہ کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ صاحب نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ بنگلے میں ایک ریفوجی خاندان آ بسا تھا۔ باہر نوکروں کے کوارٹروں میں سے ایک کوٹھڑی میں سکھوبائی رہنے لگی تھی۔ فلومینا خاصی لمبی ہو گئی تھی۔ پٹو اور وہ ماہم کے قریب ایک یتیم خانے میں پڑھنے جاتے تھے۔

جیسے ہی سکھوبائی کو میرے آنے کی خبر ملی فوراً ہاتھ میں دو چار مونگنے کی پھلیاں لئے آن دھمکی۔

"کیسا ہے بائی؟" اس نے رسماً میرے گھٹنے دبا کر پوچھا۔

"تم کیسا ہے----- صاحب کہاں ہے تمہارا؟ چلا گیا نالندہن!"

"نئیں بائی۔" سکھوبائی کا منہ سوکھ گیا۔ "ہم بولا بھی جانے کو پر نئیں گیا۔" اس کا نوکری بھی کھلاس ہو گیا تھا۔ آرڈر بھی آیا پر نئیں گیا۔" "پھر وہ گیا کہاں؟"

"ہسپتال میں!"

"کیوں کیا ہو گیا؟"

"ڈاکٹر لوگ بولتا----- کہ دارو بہت پیا۔ اس کے کارن مستک* پھر پھر گیا۔ ادھر پاگل صاب کا ہسپتل ہے۔ اچھا ایک دم فرسٹ کلاس ادھر اس کو ڈالا۔"

"مگر وہ تو واپس جانے والا تھا۔"

"کتنا سب لوگ بولا ہم بھی بولا----- بابا چلا جاوَ۔" سکھوبائی رو پڑیں "پن نہیں۔ ہم کو بولا سکھو ڈالنگ تیرے کو چھوڑ کر نہیں جائے گا۔"

نہ جانے سکھوبائی کو روتے دیکھ کر مجھے کیا ہو گیا۔ میں بالکل بھول گئی کہ

صاحب ایک غاصب قوم کا فرد ہے جس نے فوج میں بھرتی ہو کر میرے ملک کی غلامی کی زنجیروں کو چوہیرا کر دیا تھا۔ جس نے میرے ہموطن بچوں پر گولیاں چلائی تھیں۔ نہتے لوگوں پر مشین گنوں سے آگ برسائی تھی۔ برٹش سامراج کے ان گھناؤنے کل پرزوں میں سے تھا جس نے میرے دیس کے جانبازوں کا خون سڑکوں پر بہایا تھا۔ صرف اس قصور میں کہ وہ اپنا حق مانگتے تھے۔ مگر مجھے اس وقت کچھ یاد نہ رہا۔ سوائے اس کے کہ سکھوبائی کا "مرد" پاگل خانہ میں تھا۔ مجھے اپنے جذباتی ہونے پر بہت دکھ تھا کیونکہ ایک قوم پرست کو جابر قوم کے ایک فرد سے قطعی کسی قسم کی ہمدردی یا لگاؤ نہ محسوس کرنا چاہیئے۔

میں ہی نہیں سب بھول چکے تھے۔ محلے کے سارے لونڈے نیلی آنکھوں والی فلومینا پر بغیر یہ سوچے سمجھے فدا تھے کہ وہ کیڑا جس سے اس کی ہستی وجود میں آئی سفید تھا یا کالا۔ جب وہ اسکول سے لوٹتی تو کتنی ہی ٹھنڈی سانسیں اس کے جلو میں ہوتیں۔ کتنی ہی نگاہیں اس کے پاؤں تلے بچھائی جاتیں۔ کسی لونڈے کو اس کے عشق میں سر دھنتے وقت قطعی یہ یاد نہ رہتا تھا کہ یہ اسی سفید درندے کی لڑکی ہے جس نے ہری نواس کے ناکے پر چودہ برس کے بچے کو خون میں ڈبو مارا تھا۔ جس نے باہم چرچ کے سامنے نہتی عورتوں پر گولیاں چلائی تھیں۔ کیونکہ وہ نعرے لگا رہی تھیں۔

"ہندوستان چھوڑ دو!"

جس نے چوپاٹی کی ریت میں جوانوں کا خون چوڑا تھا اور سیکرٹریٹ کے سامنے سوکھے مارے ننگے بھوکے لڑکوں کے جلوس کو مشین گنوں سے درہم برہم کیا تھا۔ وہ سب بھول چکے تھے۔ بس اتنا یاد تھا کہ کندنی گالوں اور نیلی آنکھوں والی چھوکری کی کمر میں غضب کی لچک ہے موٹے موٹے گدرائے ہوئے ہونٹوں کی جنبش میں موتی رلتے ہیں۔

ایک دن سکھوبائی جھولی میں پرساد لئے بھاگی بھاگی آئی۔

"ہمارا صاب آگیا۔" ان کی آواز لرز رہی تھی۔ آنکھوں میں موتی چمک

رہے تھے۔ کتنا پیار تھا۔ اس لفظ "ہمارا" میں۔ زندگی میں ایک بار کسی کو یوں جی جان کا دم نچوڑ کر اپنا کہنے کا موقعہ مل جائے تو پھر جنم لینے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

"اچھا ہو گیا؟"

"ارے بائی پاگل بھی تھا؟ ایسا تیج صاحب لوگ پکڑ کر لے گیا تھا۔ بھاگ آیا۔۔۔۔" وہ رازداری کے لہجے میں بولیں۔

میں ڈر گئی کہ لو بھئی ایک تو ہارا ہوا انگریز اوپر سے پاگل خانہ سے بھاگا ہو۔ کس کو رپورٹ کروں۔ بمبئی کی پولیس کے لفڑے میں کون پڑتا پھرے۔ ہوا کرے پاگل میری بلا سے۔ کون مجھے اس سے میل جول بڑھانا ہے۔

لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ مجھے میل جول بڑھانا پڑا۔ میرے دل میں بھی کھدبد ہو رہی تھی کہ کسی طرح پوچھوں جیکسن انگلستان اپنے بیوئی کے پاس کیوں نہیں جاتا۔ بھلا ایسا بھی کوئی انسان ہو گا جو فردوس کو چھوڑ کر یوں ایک کھولی میں پڑا رہے اور ایک دن مجھے موقع مل ہی گیا۔ کچھ دن تک تو وہ کوٹھڑی سے باہر ہی نہ نکلا۔ پھر آہستہ آہستہ نکل کر چوکھٹ پر بیٹھنے لگا۔ وہ سوکھ کر چرخ ہو گیا تھا۔ اس کا رنگ جو پہلے بندر کی طرح لال چقندر تھا جھلس کر کتھی ہو گیا تھا۔ بال سفید ہو گئے تھے۔ چارخانہ کی لنگی باندھے میلا بنیان چڑھائے وہ بالکل ہندوستان کی گلیوں میں گھومتے پرانے گورکھوں جیسا لگتا تھا۔ اس کی نقلی اور اصلی آنکھ میں فرق معلوم ہونے لگا تھا۔ شیشہ تو اب بھی ویسا ہی چمکدار، شفاف اور "انگریز" تھا۔ مگر اصلی آنکھ گدلی بے رونق ہو کر ذرا دب گئی۔ عموماً" وہ شیشے والی آنکھ کے بغیر ہی گھوما کرتا تھا۔ ایک دن میں نے کھڑکی میں سے دیکھا تو وہ جامن کے پیڑ کے نیچے کھڑا کھوئے کھوئے انداز میں کبھی زمین سے کوئی کنکر اٹھاتا، اسے بچوں کی طرح دیکھ کر مسکراتا پھر پوری طاقت سے اسے دور پھینک دیتا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرانے اور سر ہلانے لگا۔

"کیسے طبیعت ہے صاحب؟" تجسس نے اکسایا تو میں نے پوچھا۔

"اچھا ہے۔ اچھا ہے۔" وہ مسکرا کر شکریہ ادا کرنے لگا۔

میں نے باہر جا کر ادھر کی باتیں کرنا شروع کیں۔ جلد ہی وہ مجھ سے باتیں

کرنے میں بے تکلفی سی محسوس کرنے لگا۔ پھر ایک دن میں نے موقع پا کر کریدنا شروع کیا۔ کئی دن کی جانفشانی کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک شریف زادی کا ناجائز بیٹا تھا۔ اس کے نانا نے ایک کسان کو کچھ روپیہ دے دلا کر پالنے پر راضی کر لیا۔ مگر یہ معاملہ اس صفائی سے کیا گیا کہ اس کسان کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس خاندان کا ہے۔ کسان بڑا جابر تھا۔ اس کے کئی بیٹے تھے جو جیکسن کو طرح طرح سے زک پہنچایا کرتے تھے۔ روز پٹائی ہوتی تھی۔ مگر کھانے کو اچھا ملتا تھا۔ اس نے بارہ تیرہ برس کی عمر سے بھاگنے کی کوشش کرنا شروع کی۔ تین چار سال کی مستقل کوششوں کے بعد وہ لڑھکتا پڑھکتا دھکے کھاتا لندن پہنچا۔ وہاں اس نے دنیا بھر کے پیشے باری باری اختیار کئے۔ مگر اس عرصہ میں وہ اتنا ڈھیٹ مکار اور خودسر ہو گیا تھا کہ دو دن سے زیادہ کوئی نوکری نہ رہتی۔

وہ شکل و صورت کا وجیہہ تھا۔ اس لئے لڑکیوں میں کافی ہردلعزیز تھا۔ ڈارتھی اس کی بیوی بڑے نک چڑھے خاندان کی لڑکی تھی۔ کم رو اور کم ظرف بھی تھی۔ اس کا باپ بارسوخ آدمی تھا۔ جیکسن نے سوچا اس خانہ بدوشی کی زندگی میں بڑے جھنجھٹ ہیں۔ آئے دن پولیس اور کچہری سے واسطہ پڑتا ہے۔ کیوں نہ ڈارتھی سے شادی کر کے عاقبت سنوار لی جائے۔

ڈارتھی اس کے باپ کی بیٹی اس کی دسترس سے باہر تھی وہ اونچی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کی عادی تھی مگر جیکسن کی اس وقت دونوں آنکھیں کھلی اصلی تھیں یہ تو جب ڈارتھی سے لڑ کر وہ شرابخانوں کا ہو رہا' وہاں کسی سے مار پیٹ میں آنکھ جاتی رہی۔ جب تک اس کی صرف بڑی بیٹی پیدا ہوئی تھی۔

"ہاں تم نے ڈارتھی کو کیسے گھیر کر پھانسا------؟" میں نے اور کریدا۔

"جب میری دونوں آنکھیں سلامت تھیں۔" جیکسن مسکرایا۔

کسی نہ کسی طرح ڈارتھی ہتھے چڑھ گئی۔ کم بخت کنواری بھی نہیں تھی مگر ایسے فیل مچائے کہ باپ کی مخالفت کے باوجود شادی کر لی۔ شاید وہ اپنی شادی سے ناامید ہو چکی تھی اور خود اس کی گھات میں تھی۔

باپ نے بھی لڑکی کی مجبوریوں کو سمجھ لیا- نیز بیوی کے روز روز کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اسے ہندوستان بھجوا دیا- یہ وہ زمانہ تھا جب ہر انگریز ہندوستان کے سر منڈھ دیا جاتا تھا- خواہ وہاں وہ جوتے گانٹھتا ہو یہاں آتے ہی صاحب بن بیٹھتا تھا-

جیکسن نے حد کر دی- وہ ہندوستان میں بھی ویسا ہی نکما اور لاابالی ثابت ہوا- سب سے بڑی خرابی جو اس میں تھی وہ اس کا چھچھورا پن تھا- بجائے صاحب بہادروں کی طرح رعب داب سے رہنے کے وہ نہایت بھونڈے پن سے نیٹو لوگوں میں گھل مل جاتا تھا- جب وہ بستی کے علاقے میں جنگلات کے محکمہ میں تعینات ہوا تو وہ کلب کے بجائے نہ جانے کن چنڈو خانوں میں گھومتا پھرتا تھا-

آس پاس صرف چند انگریزوں کے بنگلے تھے- بد قسمتی سے زیادہ تر لوگ معمر اور بردبار تھے- سنسان کلب میں جہاں ہندوستانیوں اور کتوں کو آنے کی اجازت نہ تھی- زیادہ تر الو بولا کرتا تھا- سب ہی افسروں کی بیویاں اپنے وطن میں رہتی تھیں- جب کبھی کسی افسر کی بیوی آتی تو وہ اسے بجائے جنگل میں لانے کے خود چھٹی لے کر شملہ یا نینی تال چلا جاتا- پھر بیوی ہندوستان کی غلاظت سے عاجز آ کر واپس چلی جاتی- اور اس کا صاحب ٹھنڈی آہیں بھرتا بیوی کی حسین یاد لئے لوٹ آتا- صاحب لوگ ویسے اپنا کام نیٹو عورتوں سے چلا لیا کرتے تھے- اس قسم کے تعلقات سے کسی کا بھی نقصان نہیں ہوتا تھا- حساب بھی سستا رہتا تھا- ہندوستان کا بھی فائدہ تھا- اس میں ایک تو ان سے پیدا ہونے والی اولاد بادامی اور کبھی خاصی گوری پیدا ہوتی تھی، اور پھر ان کے بارسوخ باپ ان کے لئے یتیم خانے اور اسکول بھی کھول دیتے تھے- سرکاری خرچہ پر ان کی دوسرے ہندوستان سے بہتر تعلیم و تربیت ہوتی تھی- یہ اینگلو انڈین خوش شکل طبقہ انگریزوں سے بس دوسرے نمبر پر تھا- لڑکے ریلوے، جنگلات اور نیوی میں بڑی آسانی سے کھپ جاتے تھے- جو معمولی شکل کی لڑکیاں ہوتیں انہیں ہندوستانی لڑکیوں کے مقابلے میں بہتر نوکریاں مل جاتیں اور وہ اسکولوں، دفتروں اور ہسپتالوں کی رونق بڑھاتیں- جو زیادہ حسین

ہوتیں وہ بڑے بڑے شہروں کے مغرب زدہ بازار حسن میں بڑی کامیاب ثابت ہوتی تھیں۔

جیکسن صاحب جب ہندوستان آیا تو اس میں کانے شخص کے تمام عیب بڑی افراط سے موجود تھے۔ شراب اس کی عادت ثانی بن چکی تھی۔ ہر جگہ اس کی کسی نہ کسی سے پخ چل جاتی اور اس کا تبادلہ ہو جاتا۔ جنگلات سے ہٹا کر اسے پولیس میں بھیج دیا گیا۔ جس کا اسے بہت ملال تھا۔ کیونکہ وہاں ایک پہاڑن پر اس کا بے طرح دل آگیا تھا۔ جبلپور پہنچ کر وہ اسے ضرور بلوا لیتا مگر وہاں سے ایک نٹنی سے عشق ہو گیا۔ ایسا شدید عشق کہ اس کی بیوی ساری چھٹیاں نینی تال میں گزار کر واپس چلی گئی اور وہ نہ گیا۔ کام کی زیادتی کا بہانہ کرتا رہا۔ چھٹی نہ ملنے کا عذر کیا۔ مگر ڈارتھی کے ڈیڈی کے کتنے ہی دوست تھے جن کی رسوخ کی وجہ سے اسے زبردستی چھٹی دلوائی گئی۔ جب وہ نینی تال پہنچا تو اس کا دل وہاں قطعی نہ لگا۔ ایک تو ڈارتھی اس کی جدائی میں اس پر بے طرح عاشق ہو گئی تھی اور چاہتی تھی دوبارہ ہنی مون منایا جائے۔ دوسری طرف اسے جیکسن کے طریقہ عشق سے بڑی وحشت ہوتی تھی۔ وہ اتنے دن ہندوستان میں رہ کر بالکل ہی اجنبی ہو چکا تھا۔ پہاڑن اور نٹنی دونوں نے اس کی ہندوستانی پتی ورتا استریوں کی طرح خدمت کر کے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔

سال میں صرف دو مہینہ کے لئے آنے والی بیوی بالکل اجنبی ہو گئی تھی۔ پھر اس کے سامنے جیکسن کو تکلفات برتنا پڑتے تھے۔

ایک دن نشہ میں اس نے کچھ پہاڑن اور نٹنی کے انداز محبت کا اپنی بیوی سے بھی مطالبہ کر دیا۔ وہ ایسی چراغ پا ہوئی کہ جیکسن کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے بہت جرح کی بہت کریدا کہ "کہیں تم بھی دوسرے بے غیرت اور پنچ انگریزوں کی طرح لوکل عورتوں سے میل جول تو نہیں بڑھانے لگے ہو۔" جیکسن نے قسمیں کھائیں اور ڈارتھی کے اتنے پیار لئے کہ وہ اس کی پارسائی کی قائل ہو گئی۔ اسے بڑا ترس آیا اور بڑے اصرار سے وہ اسے جبلپور لے آیا۔ مگر وہ وہاں کی مکھیوں اور

گرمی سے بوکھلا کر نیم پاگل ہو گئی۔ اور تو سب جھیل جاتی مگر جب اس کے غسل خانے میں دو موئی نکلی تو وہ اسی وقت سامان باندھنے لگی۔ جیکسن نے بہت سمجھایا کہ یہ سانپ نہیں اور کاٹتا بھی نہیں مگر اس نے ایک نہ سنی اور دوسرے دن دہلی چلی گئی۔

وہاں سے اس نے زور لگا کر اس کا تبادلہ بمبئی کروا دیا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب دوسری جنگ شروع ہو چکی تھی۔ نٹی کی جدائی اور ڈارتھی کا بمبئی میں مستقل قیام سوہان روح بن گیا۔ سکھو بائی بچوں کی آیا کا ہاتھ بٹانے کے لئے رکھی گئی تھی۔ مگر جب بارش سے جی چھوڑ کر ڈارتھی مع بچوں کے وطن گئی تو جیکسن کی نظر عنایت اس پر پڑی۔ اف کس قدر الجھی ہوئی داستان تھی صاحب کی۔ کیونکہ سکھو بائی اصل میں گنپت ہیڈ بیرے کی رکھیل عورت تھی وہ اسے پون پل سے پھسلا لایا تھا۔ ویسے بیوی بچوں والا آدمی تھا۔ بوجھ سے بچنے کے لئے اسے بطور کمائن کے بچوں کے آیا کے نیچے رکھوا دیا تھا۔ سکھو بائی اپنی اس نوکری سے جس میں زمین پونچھنے، برتن دھونے کے علاوہ گنپت کے ناز اٹھانا بھی شامل تھا۔ کافی مطمئن تھی۔ گنپت اسے کبھی اپنے کسی دوست کو بھی ازراہ کرم یا قرضہ کے عوض میں دے دیا کرتا تھا۔ مگر بڑی چالاکی سے کہ بہت دن تک سکھو بائی کو بھی پتہ نہ چلا۔ وہ پینے سے تو پہلے ہی کچھ واقف تھی۔ گنپت کی صحبت میں پابندی سے شام کو ٹھرا چڑھانے لگی۔ گنپت گاہک کو اپنی کوٹھڑی میں لے آتا۔ جیکسن کا ڈر تو کسی کو تھا نہیں۔ سب کام کاج چھوڑ کر نوکر مزے سے جوا کھیلتے، ٹھرا پیتے بلکہ سارے شیوا جی پارک کے غنڈے ڈارتھی کے جاتے ہی صاحب کے بنگلے پر ٹوٹ پڑتے اور رات گئے تک ہلڑ مچا رہتا۔

شراب جب خوب چڑھ جاتی ہے تو وہ سکھو بائی کو اس آدمی کے پاس چھوڑ کر کسی بہانے سے چلا جاتا۔ سکھو بائی سمجھتی کہ وہ گنپت کو الو بنا رہی ہے اور آہستہ آہستہ وہ صاحب کی خدمت کرتے کرتے بیوی کی عوضی بھی بھگتنے لگی۔ اسی طرح گنپت کے چکر سے چھٹی ملی۔ وہ کم بخت الٹا اس کی ساری تنخواہ اینٹھ لیا کرتا تھا۔

ان ہی دنوں گنپت فوج میں سے بیرے کی حیثیت سے مڈل ایسٹ چلا گیا اور سکھو بائی مستقل میم صاحب کی جگہ جم گئی۔ بس جب چھٹیوں میں میم صاحب آتی تو وہ اپنی کھولی میں منتقل ہو جاتی۔ اور جب وہ اپنی پتلی کوک دار آواز میں ----

"آیو- دود-----" پکارتیں تو وہ فوراً سب کام چھوڑ چھاڑ کے۔

"یس میم صاحب" کہہ کر لپکتی۔ یوں تو میم صاحب سکھ کر وہ اپنے آپ کو بڑی انگریزی دان سمجھنے لگی تھی۔ انگریزی زبان میں یس۔ نو۔ ڈیم فول سو آئین کے سوا اور ہے ہی کیا؟"

حاکموں کا ان چند الفاظ میں ہی کام نکل جاتا ہے۔ لمبے چوڑے ادبی جملوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تانگہ کے گھوڑے کو ٹخ ٹخ اور چابک کی زبان ہی کافی ہوتی ہے۔ مگر سکھو بائی کا یہ نہیں معلوم تھا کہ انگریز کی گاڑی میں "جتا ہوا مریل گھوڑا الف ہو کر گاڑی لوٹ چکا تھا اور اب اس کی لگامیں دوسرے ہاتھوں میں تھیں اس کی دنیا بڑی محدود تھی وہ خود اس کے دو بچے اور اس کا "مرد!"

جب میم صاحب ہندوستان آیا کرتی تھی۔ جب بھی سکھو بائی بڑی فراخدلی سے عیوضی چھوڑ کر پھر نینی کے ساتھ کے نیچے کام کرنے لگتی۔ اسے میم صاحب سے قطعی کوئی حسد نہیں تھا۔ میم صاحب مغربی حسن کا نمونہ ہو تو ہو۔ ہندوستانی معیار حسن کے ترازو میں اسے تولا جاتا تو جواب صفر ملتا۔ اس کی جلد کھرچے ہوئے شلغم کی طرح کچی پکی تھی۔ جیسے اسے پوری طرح پکنے سے پہلے ڈال سے توڑ لیا گیا ہو۔ یا ٹھنڈی بے جان اندھیری قبر میں برسوں دفن رکھنے کے بعد نکالا ہو۔ اس کے چھدرے میلی چاندی کے رنگ کے بال بالکل بوڑھیوں کے بالوں کی طرح لگتے تھے۔ اس لئے سکھوبائی کے درجے کے لوگ اسے بڑھیا سمجھتے تھے یا پھر سورج مکھی جسے ہندوستان میں بڑا قابل رحم سمجھا جاتا ہے۔" جب وہ منہ دھوئے ہوتی تو اس کی پنسل سے بنائی ہوئی بھنویں غائب ہوتیں۔ چہرہ ایسا معلوم ہوتا گویا کسی نے تصویر کو سستے ربڑ سے بگاڑ دیا ہو۔"

پھر ڈار تھی سرد تھی، اجنبی تھی۔ جیکسن کا وجود اس کے لئے ایک گھناؤنی

گالی تھا۔ وہ اپنے کو نہایت بدنصیب اور مظلوم سمجھتی تھی۔ اور شادی کو ناکامیاب بنانے میں حق بجانب تھی۔ خواہ جیکسن کتنے ہی بلند عہدے پر پہنچ جاتا وہ اس پر فخر نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ سارے عہدے خود ڈارتھی کے باپ کے دلائے ہوئے ہیں جو کسی بھی احمق کو دلا دیئے جاتے تو وہ آسمانوں کو چھو لیتا۔

"اس کے برخلاف لکھوائی اپنی تھی ----- گرما گرم تھی۔ اس نے یون پل پر الاؤ کی طرح بھڑک کر ہزاروں کے ہاتھ تاپنے کا سامان مہیا کیا تھا۔ وہ گنپت کی رکھیلی تھی جو اسے اپنی پرانی قمیض کی طرح دوستوں کو ادھار دے دیا کرتا تھا" اس کے لئے جیکسن صاحب دیوتا تھا۔ شرافت کا اوتار تھا۔" اس کے اور گنپت کے پیار کے طریقہ میں کتنا فرق تھا، گنپت تو اسے منہ کا مزہ بدلنے کے لئے چبا چبا کر تھوکتا۔ اور صاحب ایک مجبور ضرورت مند کی طرح اسے امرت سمجھتا۔ اس کے پیار میں ایک بچے جیسی لاچاری تھی۔"

جب انگریز اپنا ٹاٹ پلان لے کر چلے گئے تب وہ نہیں گیا۔ ڈارتھی نے اسے بلانے کے سارے جتن کر ڈالے۔ دھمکیاں دیں مگر اس نے استعفیٰ دے دیا اور نہیں گیا۔

"صاحب تمہیں اپنے بچے بھی یاد نہیں آتے؟" میں نے ایک دن اس سے پوچھا۔

"بہت یاد آتے ہیں۔ فلو شام کو دیر سے آتی ہے اور پٹو لونڈوں کے ساتھ کھیلنے چلا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ کبھی میرے پاس بھی بیٹھیں۔" وہ اڑن گھائیاں بتانے لگا۔

"پٹو اور فلومینا نہیں ا ستھر اور لِذا۔" میں نے بھی ڈھٹائی لادلی۔

"نہیں ----- نہیں -----" وہ ہنس کر سر ہلانے لگا۔ "پلے صرف کتیا سے مانوس ہوتے ہیں اس کتے کو نہیں پہچانتے جو ان کے وجود میں ساجھے دار ہوتا ہے۔" اس نے اپنی اصلی آنکھ مار کر کہا۔

"یہ جاتا کیوں نہیں یہاں پڑا سڑ رہا ہے۔" یہ میں ہی نہیں آس پاس کے

سب ہی لوگوں کو بے چینی سی ہوتی تھی۔

"جاسوس ہے' اسے جان بوجھ کر یہاں رکھا گیا ہے تاکہ یہ ملک میں دوبارہ برطانوی راج کو لانے میں مدد دے۔" کچھ لوگ یوں بھی سوچتے۔ گلی کے لونڈے جب وہ دکھائی دیتا' یہی پوچھتے۔

"صاب ولایت کب جائے گا؟"

"صاب کوئٹ انڈیا ہے کو نئیں کرتا؟"

"ہندوستان چھوڑ دو صاب!"

"انگریزی چھورا چلا گیا۔"

"وہ گورا گوڑا چلا گیا۔"

"پھر تم کائے کو نہیں جاتا؟ سڑک پر آوارہ گھومنے والے لونڈے اس کے پیچھے دھیریں لگاتے آواز کستے۔"

"ہوں ----- ہونہوں----- جائے گا----- جائے گا بابا!" وہ سر ہلا کر مسکراتا اور اپنی کھولی میں چلا جاتا۔

تب مجھے اس کے اوپر بڑا ترس آتا۔ کہاں ہیں دنیا کے رکھوالے جو ہر کمزور ملک کو تہذیب سکھاتے پھرتے ہیں۔ ننگوں کو تپلون اور فراکیں پہناتے پھرتے ہیں۔ اپنے سفید خون کی برتری کا ڈھول پیٹتے ہیں۔ ان کا ہی خون ہے جو جیکسن کے روپ میں کتنا ننگا ہو چکا ہے۔ مگر اسے کوئی مشنری ڈھانکنے نہیں آتا۔

اور جب گلی کے لفنگے تھک ہار کر چلے جاتے تو وہ اپنی کھولی کے سامنے بیٹھ کر بیڑی پیا کرتا۔ اس کی اکلوتی آنکھ دور افق پر اس ملک کی سرحدوں کو تلاش کرتی جہاں نہ کوئی گورا ہے۔ نہ کالا نہ کوئی زبردستی جا سکتا ہے۔ نہ آسکتا ہے اور نہ وہاں بدکار مائیں اپنے ناجائز بچوں کو تیری میری چوکھٹ پر جن کو خود اپنی باوقار دنیا بسا لیتی ہیں۔

سکھوبائی آس پاس کے گھروں میں کمائین کا کام کرتی----- اچھا خاصا کما لیتی۔ اس کے علاوہ وہ بانس کی ڈلیاں' میز کرسی وغیرہ بنا لیتی تھی۔ اس ذریعہ سے کچھ

آمدنی ہو جاتی۔ جیکسن بھی اگر نشے میں نہ ہوتا تو الٹی سیدھی بے پیندے کی ٹوکریاں بنایا کرتا۔ شام کو سکھو بائی اس کے لئے ایک ٹھرے کا ادھا لا دیتی جو وہ فوراً چڑھا جاتا اور پھر اس سے لڑنے لگتا۔ ایک رات اس نے نہ جانے کہاں سے ٹھرے کی پوری بوتل حاصل کر لی اور ساری رات پیتا رہا۔ صبحدم وہیں کھولی کے آگے پڑ کر سو گیا۔ فلومینا اور پٹو اس کے اوپر سے پھلانگ کر اسکول چلے گئے۔ سکھو بائی بھی تھوڑی دیر اسے گالیاں دے کر چلی گئی۔ دوپہر تک وہ وہیں پڑا رہا۔ شام کو جب بچے آئے تو وہ دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھا تھا۔ اسے شدید بخار تھا جو دوسرے دن بڑھ کر سرسام کی صورت اختیار کر گیا۔

ساری رات وہ نہ جانے کیا بڑبڑاتا رہا۔ نہ جانے کسے یاد کرتا رہا شاید اپنی ماں کو جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جو اس وقت کسی شاندار ضیافت میں شریک "اخلاقی اصلاح بندی" پر کر رہی ہو گی۔ یا وہ باپ یاد آ رہا ہو جس نے نسل چلانے والے سانڈ کی خدمت ادا کرنے کے بعد اسے اپنے جسم سے بہی ہوئی غلاظت سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ اور جو اس وقت کسی دوسرے محکوم ملک میں بیٹھا قومی اقتدار قائم کرنے کے منصوبے بنا رہا ہو گا۔ یا ڈارتھی کے طعنوں بھرے احسان یاد آ رہے تھے۔ جو بے رحم کسان کے ہنٹروں کی طرح ساری عمر اس کے احساسات پر برستے رہے یا شاید وہ گولیاں جو اس کی مشین گن سے نکل کر بے گناہوں کے سینوں کے پار ہوئیں اور آج پلٹ کر اسی کی روح کو ڈس رہی تھیں۔ وہ رات بھر چلاتا رہا سر پٹختا رہا۔ سینے کی دھونکنی چلتی رہی۔ در و دیوار نے پکار پکار کر کہا۔

"تیرا کوئی ملک نہیں ----- کوئی نسل نہیں ----- کوئی رنگ نہیں۔"

"تیرا ملک اور نسل سکھو بائی ہے جس نے تجھے بے پناہ پیار دیا کیونکہ وہ بھی اپنے دیس میں غریب الوطن ہے۔ بالکل تیری طرح۔ ان کروڑوں انسانوں کی طرح جو دنیا کے ہر کونے میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ نہ ان کی ولادت پر شادیانے بجتے ہیں نہ موت پر ماتم ہوتے ہیں!"

"پو پھٹ رہی تھی۔ ملوں کی چمنیاں دھواں اگل رہی تھیں اور مزدوروں کی

قطاروں کو نگل رہی تھیں۔ تھکی ہاری رنڈیاں اپنے رات بھر کے خریداروں کے چنگل سے پنڈا چھڑا کر انہیں رخصت کر رہی تھیں۔

"ہندوستان چھوڑ۔"

"کوئٹ انڈیا۔"

طعن اور نفرت میں ڈوبی آوازیں اس کے ذہن پر ہتھوڑوں کی طرح پڑ رہی تھیں۔ اس نے ایک بار حسرت سے اپنی عورت کی طرف دیکھا جو وہیں پٹی پر سر رکھ کر سو گئی تھی۔ نلومیا رسوئی کے دروازے میں ٹاٹ کے ٹکڑے پر سو رہی تھی۔ پٹو اس کی کمر میں منہ گھسائے پڑا تھا۔ کلیجے میں ایک ہوک سی اٹھی اور اس کی اصلی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر میلی دری میں جذب ہو گیا۔

برطانوی راج کی مٹتی ہوئی نشانی ایرک ولیم جیکسن نے ہندوستان چھوڑ دیا۔

روشن

اصغری خانم ،، ،اتوں میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ ایک تو دین و دھرم کے معاملے میں اور دوسرے شادیاں کروانے میں------ ان کی بزرگی اور پارسائی میں تو کسی شے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ سب کو یقین تھا کہ انہوں نے اتنی عبادت کی ہے کہ جنت میں ان کے لئے ایک شاندار اور زمرد کا محل ریزرو ہو چکا ہے۔ حوریں اور فرشتے وہاں ان کی راہ دیکھ رہے ہیں کہ کب خدا کا حکم ہو اور وہ وضو کا بدھنا' جائے نماز اور تسبیح سنبھالے برقع پھڑکائے جنت کی دہلیز پر ڈولی سے اتریں۔ اور وہ انہیں دودھ اور شہد کی نہروں میں تیرا کر پتے اور بادام کے گھنے درختوں کی چھاؤں میں ٹہلاتے ہوئے زمرد کے محل میں بٹھا دیں اور ان کی سیوا پر جٹ جائیں۔

اصغری خانم کا غصہ ہمیشہ ناک پر دھرا رہتا تھا۔ اگر ذرا بھی کسی جنتی بیوی نے چیں چپڑ کی تو وہ اس کی سات پشت کے مردے اکھاڑنے لگیں گی اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے گی اور دوزخ کی آگ کی پناہ لے گی۔

دور دور خانم کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ انہیں ساری دنیا کا کچا چٹھا معلوم تھا۔ مجال تھی جو کوئی ان کے سامنے بڑھ چڑھ کر بولے۔ غازی پور سے لے کر لندن تک کی ہر بدکار عورت کا بھید جانتی تھیں۔

"اے ہے کوئی بیاہی تیاہی ڈھڈو نے لگوڑے بادشاہ کو پھانس لیا۔" وہ مسز سمسن اور ایڈورڈ ہشتم کے عشق پر تبصرہ کرتیں۔ "منہ جلی کو لاج بھی تو نہ آئی۔ میرا بس چلتا تو تخصمی (جس نے تین خصم کئے ہوں) کا چونڈا جھلس دیتی۔"

مگر مصیبت یہ تھی کہ ان کا بس نہیں چل سکتا تھا۔ لندن سات سمندر پار تھا۔ اور ان کو گھٹنوں میں آئے دن ٹیسیں اٹھتی رہتی تھیں۔ چونڈا جھلنے کیسے جاتیں۔ اتنا دم ہوتا تو توجہ نہ کرتیں۔

مگر شادیاں کرانے میں تو وہ ایسے ایسے معرکے مار چکی تھیں کہ دنیا میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ قریب قریب ناممکن قسم کی شادیاں کرانے کا انہوں نے ریکارڈ قائم کر دیا۔ جسے وہ خود ہی آئے دن توڑا کرتی تھیں۔ بس اسی وجہ سے لوگ ان کی بڑی آؤ بھگت کیا کرتے تھے۔ کنواریاں کس گھر کا بوجھ نہیں ہوتیں۔ جس گھر میں چلی جاتیں۔ لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے سر جھکا کر ان کی گالیاں' کوسنے' طعنے' معنے سنتے۔ انہوں نے ایسی ایسی ڈراؤنی شکل کی لڑکیوں کے نصیب کھولے تھے کہ لوگوں پر ان کی ہیبت بیٹھ گئی تھی خاص طور پر یہ کنوارے لڑکے تو ان سے کانپتے تھے۔ جیسے وہ موت کا فرشتہ ہوں نہ جانے کس پر مہربان ہو جائیں اور اپنے بٹوے میں سے کوئی پھپھل پائی نکال کر سر پر منڈھ دیں۔ جہاں کوئی شادی کے لائق نظر پڑ جاتی وہ پنجے جھاڑ کر اس کے ماں باپ اور سارے محلے ٹولے والوں کے پیچھے لگ جاتیں اور شادی کے قبل لڑکے تھرا اٹھتے مگر وہ شادی کرا کے ہی دم لیتیں۔ کچھ ایسا پینترا چلتیں کہ الٹا لڑکا دہلیز پر ناک رگڑنے لگتا۔ لوگوں کا کہنا تھا ان کے قبضے میں جنات ہیں جو ان کا ہر حکم بجا لاتے ہیں۔

مگر ایک جگہ ان کے سارے ہتھیار کند ثابت ہوئے۔ تمام تعویذ گنڈے چوپٹ ہو گئے۔ ان کی اپنی ممیری بہن توفیق جہاں کی بیٹی صبیحہ کو چوبیسواں سال لگ چکا تھا اور ابھی تک کوار کو ٹلہ چنا ہوا تھا۔ اس سے چھوٹی عقیلہ منگی ہوئی تھی۔ عقیلہ کی پیٹھ کی میمونہ کالج میں پڑھتی تھی۔ سب سے چھوٹی منو تھی۔

قبر کے بھی چار کونے ہوتے ہیں۔ توفیق جہاں کی قبر چنی کھڑی تھی۔ آج تک خاندان میں نہ کوئی باہر کی لڑکی آئی تھی نہ گئی تھی۔ کھرے سیدوں کے گھرانے کو داغ لگانے کی کسے ہمت تھی۔ لڑکوں کا تو دن بدن کال پڑتا جا رہا تھا۔ کسی کی تنخواہ ٹھیک ہے تو ہڈی میں کھوٹ' کوئی کمبوہ ہے تو کوئی پٹھان۔ ایک بیچارے انجینئر

کی شامت آئی۔ پیغام بھجوا دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہے ہے موئے انصاری ہیں۔ اصغری خانم نے سینہ گرہ شروع کر دی طوفان کھڑا کر دیا۔ ان کے جیتے جی بیٹی انصاریوں میں جائے ایسی بھاری چھاتی کا بوجھ ہے تو کوٹیاں میں ڈال دو۔

یہ جب کی بات ہے جب صبیحہ کو میٹھا برس لگا تھا۔ اس کے بعد جب چھ برس چھ صدیوں کی طرح چھاتی پر سے دندناتے گزر گئے تو اصغری خانم کو اپنی پالیسی نرم کرنی پڑی اور یہ طے پایا کہ اچھے خاندان کا لڑکا ہو تو کوئی بڑا اندھیر نہیں۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ صبیحہ کوئی بدصورت ہو کہ کافی کھتری اور جاہل مرا میاں کا لٹھ ہو۔ سانولی سلونی بوٹا سا قد' نازک نازک ہاتھ پیر' کمر سے نیچے جھولتی ہوئی چوٹی' سوئی سوئی آنکھیں جن میں قدرتی کاجل بھرا ہوا تھا۔ جی بھر کے دیکھ لو تو نشہ آ جائے ہنس دیتی تو موتی سے رل جاتے۔ آواز ایسی میٹھی کہ نوحے پڑھتی تو سننے والوں کی ہچکی بندھ جاتی۔ اس پر سونے پر سہاگہ علی گڑھ سے پرائیویٹ میٹرک پاس کر چکی تھی۔

مگر نصیب کی بات تھی۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ ورنہ کہاں صبیحہ اور کہاں روشن۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں۔ عورت مرد کا جوڑا آسمان پر طے ہو جاتا ہے۔ اگر صبیحہ اور روشن کا جوڑا بھی آسمان پر طے ہوا تھا تو ضرور کچھ گھپلا ہو گیا۔ فرشتوں سے کچھ بھول چوک ہو گئی۔ یہ دھاندلی آسمانی طاقت نے جان بوجھ کر اصغری خانم کو ستانے کے لئے تو ہرگز نہ کی ہو گی۔

مگر الزام سارا اصغری خانم کے ماتھے تھوپ دیا گیا۔ لڑکا لڑکی صفا چھوٹ گئے اور وہ دھرلی گئیں۔ صمد میاں کو کسی نے کچھ نہ کہا کہ وہ بہن کی بانہہ پکڑ کر اسے عذاب دوزخ جھیلنے کو جھونک آئے سارا گھر منہ پیٹ کے رہ گیا۔ کسی کی ایک نہ چلی۔

ہائے اصغری خانم کہیں منہ دکھانے کی نہ رہیں۔ کیا آن بان شان تھی۔ بیچاریوں کی۔ مجال تھی جو محلہ میں ان کے بغیر کوئی کاج ہو جائے۔ کسی کی بٹیا کا کن چھیدن ہوتا تو انہیں کو دبوچ کر بیٹھنے کے لئے بلوایا جاتا۔ کسی کے بال بچہ ہوتا تو وہی

زچہ کا پیٹ تھام کر سہارا دیتیں۔ پھر توفیق جہاں تو ان کی سگی ممیری تھیں اور روشن کو شیشے میں اتارنا کوئی کھیل نہ تھا۔ اس لئے معاملہ انہی کو اپنے ہاتھوں میں لینا پڑا۔

صمد میاں چھ سال انگلستان رہ کر لوٹے تو بیٹے کی سلامتی کی خوشی میں توفیق جہاں نے میلاد شریف کروایا تھا۔ بریلی والے میاں خاص طور پر میلاد پڑھنے تشریف لائے تھے۔ سب عورتیں اندر والے گول کمرے میں بیٹھی ثواب لوٹ رہی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں چق سے لگی کھس پھس کر رہی تھیں کہ اتنے میں صمد میاں روشن کے ساتھ داخل ہوئے وہ شاید شریف کے بارے میں بھول ہی چکے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید لوٹ جاتے مگر میاں صاحب نے گھور کر دیکھا تو پکڑے گئے۔ مجبوراً" دونوں ایک طرف بیٹھ گئے۔

"ہائے یہ کون ہے؟" لڑکیوں نے روشن کو دیکھ کر کلیجے تھام لئے۔ صمد میاں کے سارے دوستوں کو دیکھا تھا۔ کم بخت سب ہی تو چرخ مرگھلے اور گھونچو تھے۔ مگر روشن اپنے نام کی طرح روشن تھے کہ آنکھیں چکا چوند ہو گئیں، کلیجے منہ کو آگئے جیسے دیوار پھاڑ کر آفتاب سوا نیزے پر آگیا۔ کیا تیز تیز جگمگاتی آنکھیں جو ہنستے میں یوں کھو جاتیں کہ جی گم ہو جاتا۔ دانت گویا موتی چن دیئے ہوں۔ چوڑے چکلے شانے لمبی لمبی بت تراشوں جیسی سڈول انگلیاں اور رنگت ----- جیسے انہوں نے بھی بوکھلا کر جلدی سے انگلیاں چوم لیں۔ ایسے بھونڈے پن سے کہ لڑکیوں کے دل اچھلنے لگے۔ بڑے میاں کا جی خوش ہو گیا۔ وہ انہیں بڑے فخر سے بھیگی بھیگی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ سید کا بیٹا انگلستان کیا امریکہ بھی چلا جائے، رہے گا کھرا سید مگر لڑکیوں کو خوب معلوم تھا کہ ان لوگوں کو خاک کچھ یاد نہیں، یونہی ملاؤں کی طرح بدبد ہونٹ ہلا رہے تھے۔ ان کی اس شرارت پر اتنی بری طرح ہنسی کا حملہ ہوا کہ صغرا خانم نے دور سے پنکھے کی ڈنڈی دکھا کر دھمکایا تب کہیں جا کر ہنسی نے دم توڑا۔

میلاد شریف کے خاتمے پر جب سلام پڑھا گیا۔ تو سب کھڑے ہو گئے۔ بڑے میاں نے محبت سے لڑکوں کی طرف دیکھ کر سلام پڑھنے میں شریک ہونے کا

اشارہ کیا۔

"پڑھو میاں' خاموش کیوں ہو۔"

"جی-----!-----جی!"

خدا کے حضور میں جو دل سے نکلے وہی اسے منظور ہوتا ہے۔" انہوں نے روشن کو ایسے گھورا کہ وہ سہم کر ساتھ دینے لگے۔ صمد میاں نے بھی ایک تان کچھ "اولڈ مین ردر" سے سروں میں لگائی۔ مگر روشن نے سنبھال لیا۔ کیا بھاری بھرکم پرسوز آواز تھی کہ بڑے میاں پر تو رقت طاری ہو گئی۔ ولایت پلٹ لڑکوں سے بدظن تمام بزرگ اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر رہ گئے۔

"ارے صاحب سچا مسلمان چاہے کافروں میں رہے چاہے مسجد میں اس کے ایمان پر داغ نہیں پڑتا۔ ماشاء اللہ روشن میاں کے گلے میں عقیدے کا سوز بھرا ہوا ہے۔" بڑے میاں نے آستین کے کونے سے آنکھیں صاف کرکے فرمایا اور روشن کے چہرے پر نور کی چمک دمک دیکھ کر کھل اٹھے۔

صبیحہ کی کٹورہ جیسی آنکھیں چھل چھل برس اٹھیں۔ ٹکٹکی باندھے وہ انہیں تکتی رہ گئی۔ جب لڑکیوں نے قاعدے کے مطابق اسے چھیڑا تو وہ جھوٹوں کو بھی نہ بگڑی۔ زندگی میں پہلی بار ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی پرانا جان پہچان کا مل گیا ہو۔

صمد میاں جب گھر میں آئے تو ہر ایک کا چہرہ روشن کے پرتو سے جگمگا رہا تھا۔ سوائے صبیحہ کے جس نے چاروں طرف سے گھیر کر سوالوں کی بھرمار کر دی۔ کون ہیں۔کیا کرتے ہیں۔

"اے کس کا لڑکا ہے؟" صغرا خانم نے لگامیں اپنے ہاتھ میں لے لیں-----

"اپنے باپ کا۔" صمد نے لاپروائی سے ٹال دیا اور چائے باہر بھجوانے کے لئے کہا۔

"اے ہے لڑکے ہر وقت کا مذاق نہیں جاتا۔ یہ بتا اس کے باپ کون ہیں؟"

"ہیں نہیں----- تھے----- فورسٹ آفیسر تھے۔ تین سال ہوئے

ڈیبھ ہو گئی ان کی۔"

"انا للہ وانا الیہ راجعون! کیا کرتا ہے لڑکا؟" نانی بی نے پوچھا۔

"کون سا لڑکا؟" صمد نے جاتے جاتے پلٹ کر پوچھا۔

"اے یہی تیرا دوست۔"

"روشن؟" ڈاکٹر ہے ایم۔ ڈی کی ڈگری لینے ساتھ ہی گیا تھا۔ پھر وہیں انگلینڈ میں نوکری کر لی۔ کچھ کھانے کو بھجوا دیجئے۔ مگر میرے کمرے میں بھجوایئے گا۔ باہر درجن بھر بڈھے بیٹھے ہیں۔ سب ہڑپ کر جائیں گے۔ یہ بڑھاپے میں لوگ اتنے ندیدے کیوں ہو جاتے ہیں------؟"

صغرا خانم فوراً خم ٹھوک کر میدان میں پھاند پڑیں۔ تیر تلوار سنبھالے اور ہلہ بول دیا۔

"اے صمد میاں جیسے تم ویسے تمہارا دوست۔ اس سے کیا پردہ؟ ادھری گول کمرے میں بلا لو۔" وہ آنکھوں میں رس گھول کر بولیں۔ ان دنوں سیدوں میں بھی کانا پردہ شروع ہو گیا ہے۔ خاندان کے بڑے بوڑھوں کی آنکھ بچا کر لڑکیاں کھلے منہ نمائش میں جائیں۔ مشاعروں میں شریک ہوں' سہیلیوں کے بھائیوں سے اور بھائیوں کے دوستوں سے بڑی بوڑھیوں کی رضا مندی لے کر ملیں مگر سڑک پر جاتے وقت تانگہ پر پردہ باندھا جاتا ہے۔ بزرگوں کو دکھانے کے لئے۔ صمد روشن کو گول کمرے میں لے آئے۔ صبیحہ کے سوا سب وہیں چائے پینے لگے۔

صبیحہ کو صغرا خانم کمرے میں گھیرے چوکھے حملے کر رہی تھیں۔ اس کا بس چلتا تو جہیز کا کوئی بھاری زرتار جوڑا پہنا دیتیں۔ مگر صبیحہ حسب عادت بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو لئے سو رہی تھیں۔ گھر میں جب کوئی موٹا مرغا آتا تو اسے یونہی سجایا جاتا۔ بیچاری کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو جاتے' منہ لٹک جاتا اور ناک پر پسینہ پھوٹ نکلتا اور شکل چوٹی بلی کی سی ہو جاتی۔ جب سے کئی پیغام آ کر پھر گئے۔ تب سے اسے اور بھی وحشت ہونے لگی تھی۔ روشن جیسا ہینڈسم اور کماؤ بر بھلا کیسے پھنسے گا۔ ذرا کوئی لڑکا کسی قابل ہوا تو خاندان والے ہی رشتہ کا حق وصول کرنے

دوڑ پڑتے ہیں۔ پھر ملنے ملانے والوں کی باری آتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی شادی بھی ہو چکی ہو۔ دو بچے ہوں!

مگر اصغری خانم کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ نہ انہوں نے دھوپ میں چونڈا سفید کیا تھا۔

"لونڈا خیر سے کنوارا ہے' بیاہے مرد کا ڈھنگ اور ہی ہوتا ہے۔" دوسرے انہوں نے پہلے ہی صمد سے پوچھ لیا تھا۔

"بیوی بچے سنگ ہی ہیں؟"

"کس کے؟ روشن کے----- ارے اس گدھے کے بیوی بچے کہاں۔ ابھی تو خود ہی بچہ ہے۔ مجھ سے دو سال چھوٹا ہے۔"

بس اصغری خانم نے جھٹ حساب لگا لیا کہ صبیحہ سے چار سال بڑا ہوا۔ خوب جوڑی رہے گی۔ اس سے کم فرق ہو تو چار بچوں بعد بیوی میاں کی اماں لگنے لگتی ہے۔ ویسے مرنے والے تو اصغری خانم سے بیس برس بڑے تھے۔ ہائے کیا عشق تھا اپنی دلہن جان سے!

مگر اصغری خانم جب سجا بنا کر صبیحہ کو گول کمرے میں لائیں تو روشن جا چکے تھے؟ اصغری خانم کا بس چلتا تو چیختی چلاتی ان کے پیچھے لپکتیں۔ مگر صمد میاں کی انہوں نے خوب ٹانگ لی۔

"جوان بھنیا کی پال کب تک ڈالو گے۔ کیا سفید چونڈے میں افشاں چنی جائے گی۔ تم ہی کچھ نہ کرو گے تو کون کرے گا؟"

"کون ہیں؟" صمد خواہ مخواہ چڑ گئے۔ "مجھ سے خود تو اپنی شادی ہو نہیں رہی ہے دوسروں کی کیا کروں گا؟"

"مذاق میں ہر بات کو ٹال دیتے ہو۔ آج اس کا باپ زندہ ہوتا تو۔" اصغری خانم ٹسر ٹسر رونے لگتیں۔ "آخر کیا ہو گا ان چار چٹانوں کا۔ توفیق نگوڑی کو ہول دل کے دورے نہ پڑیں تو اور کیا ہو۔"

"کون سی چٹانیں؟ صمد میاں انجینئر تھے۔ انہیں چٹانوں' پہاڑیوں سے بڑی

دلچسپی تھی۔

"اے میاں بنو مت اللہ رکھنے اب تم اس قابل ہو اپنے دوستوں میں سے ڈھونڈو کوئی؟"

"بھئی میں ان جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔" وہ ٹال کر چل دیئے۔

مکھن میں زعفران کے ساتھ چٹکی بھر شہابی رنگ ملا دیا ہو۔ پنچوں نے دیکھا کہ صبیحہ کے سلونے چہرے پر یکایک ہلدی بکھر گئی۔ گھنی گھنی پلکیں لرزیں اور جھپک گئیں۔ ہونٹ میٹھے میٹھے ہو گئے۔ لڑکیوں کو مکاری سے مسکراتا دیکھ کر بگڑ بیٹھی۔

صمد میاں اور روشن ننگے سر بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر ایک ڈاڑھی والے بزرگ غرائے۔

"اے صاحب زادے اتنے بھی جنٹلمین نہ بنئے۔ میلاد شریف کے موقع پر ننگے سر بیٹھنے والوں کے سر پر شیطان دھولیں مارتا ہے۔"

"روشن نے سہم کر صمد کی طرف دیکھا انہوں نے جھٹ جیب سے رومال نکال کر چپاتی کی طرح سر پر منڈھ لیا۔ روشن نے بھی ان کی نقل کی۔ ہوا سے رومال اڑتا تو بندر کی طرح سر پر ہتھیلی جما کر بیٹھ گئے۔ ایسی بھولی بھالی شکل لگی کہ لڑکیوں کی پارٹی میں گدگدی رینگ گئی۔ صبیحہ کے مکھڑے کی ہلدی میں ایک دم گلال کھل گیا اور نارنجی رنگ پھوٹ نکلا۔

ڈاڑھی والے حضرت جو مونچھ ڈاڑھی صفاچٹ ولایت پلٹ لڑکوں کی گھات میں بیٹھے تھے اور اپنی قہر آلود نگاہیں دونوں پر گاڑ رکھی تھیں مگر یہ دونوں بھی چوکنے بیٹھے تھے اور بالکل بندروں کی طرح ان کی نقل میں آنکھیں بند کر کے جھوم جھوم کر سن رہے تھے اور سر دھن رہے تھے۔ بڑے میاں نے درود پڑھ کر انگلیوں کے پوروں کو چوما اور آنکھوں سے لگا لیا۔ جھٹ صمد میاں نے ان کی نقل کی اور روشن کو کہنی ماری۔

چل دیئے۔

مگر آندھی طوفان ٹلے اصغری خانم کو کون ٹالے؟ آتے جاتے ٹانگ لیتیں۔

پھر انہیں ایک انوکھی ترکیب سوجھی- وہ فوراً کسی جان لیوا اور انجانے مرض میں مبتلا ہو گئیں- اور عین اس وقت جب روشن صمد میاں سے ملنے آئے- ان پر سخت بھیانک قسم کا دورہ پڑ گیا- اتنے زور سے آہیں بھریں کہ بیچارے بدحواس ہو گئے- بڑی دیر تک دیکھتے بھالتے رہے- اصغری خانم آخری وقت میں بھلا صبیحہ کا ہاتھ کیوں کر چھوڑ دیتیں- وہ ان کے سرہانے سہمی ہوئی بیٹھی رہی کہ کہیں چور پکڑ نہ لیا جائے- انہیں خاموش دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ اصغری بوا کی چال پکڑی گئی-----

"کیا بیماری ہے؟" انہوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا-

"یو پوچھئے کون سی بیماری نہیں ہے- گردوں کی حالت خراب ہے معدہ قطعی کام نہیں کرتا- دل بس ذرا سا دھڑک رہا ہے- آنتوں میں زخم ہیں- بھیپھڑوں کے نیچے پانی اتر آیا ہے- انہوں نے صمد کو ایک طرف لے جا کر کہا- صبیحہ نے سنا تو ہنسی نہ روک سکی- اصلی مرض کی طرف تو انہوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا-

"اماں جناؤ بھی اتنی بیماریاں ہوتیں تو زندہ کیسے رہ سکتی تھیں اور زندہ بھی کیسی، سارے خاندان پر چابک پھٹکارتی ہیں-" صمد بولے-

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں یہ زندہ کیسے ہیں- کچھ ایسی لیپا پوتی ہوتی رہتی ہے کہ کھنڈر کھڑا ہے- ڈاکٹری سے بڑھ کر کوئی طاقت کام کر رہی ہے-" اصغری بوا ٹھنکیں اور پھڑک اٹھیں-

"اوئی نوج----- دور پار----- اے لو میرے دشمن کاہے کو لب گور ہوتے-"

"اے میاں تم ڈاکٹر ہو کہ نرے سلوتری- اے چولہے میں جائیں تمہاری دوائیں- موئی فرنگیوں کی دواؤں میں دنیا بھر کی قلتیں ہوتی ہیں تھو-" وہ بڑبڑائیں-

"بس اللہ پاک عزت آبرو سے اٹھا لے- اے لڑکے ٹھیک سے بیٹھ- نگوڑیو کچھ شربت پانی لاؤ کہ گدھیوں کی طرح کھڑی منہ دیکھ رہی ہو- اے بچے کے بہنیں ہیں تیری-" اچانک صغرا خانم نے پینترا بدلا-

"ایں-----؟ جی دو----- دو بڑی بہنیں----- ایک بیوہ ہے؟"

روشن نے سنبھل کر وار روکا۔

"چہ ہے ہے اور دوسری کہاں بیاہی ہیں۔"

"کانپور میں سول انجینئر ہیں ان کے۔"

"اے کانپور ہی میں تو اپنے تقی میاں کے خلیا ساس رہویں ہیں۔ کیا نام ہے اللہ رکھے بہنوئی کا۔"

"ایس این کچلو۔" صمد میاں بولے۔ "کیوں کیا کچھ بنوانے کا ارادہ ہے۔"

"ہاں اپنی قبر بنواؤں گی۔ اچھا تو تم لوگ کشمیری ہو۔" بے چاری کچھ بجھ گئیں۔

"یہ سیف الدین کچلو کے خاندان سے کچھ ہے میل۔"

"جی وہ میرے چچا کے دوست تھے۔"

روشن کے جانے کے بعد تڑپ کر مریضہ اٹھ بیٹھیں۔

"بھئی سوچ لو کشمیری ہیں۔"

"ہاں اور اس سے پہلے جو پیغام آیا تھا وہ لوگ کمبوہ تھے۔ بس یہی دیکھتی رہو۔ ارے سب انسان برابر ہیں۔ پاک پروردگار نے سب کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ مسلمانوں میں ذات پات چھوت چھات نہیں ہوتی۔" توفیق جہاں بگڑنے لگیں۔

"بھئی مجھے یہ صبیحہ کے نخرے پھوٹی آنکھ نہیں بھاتے۔ ادھر وہ آیا اور ادھر بنو نہ تھوتھا کر بھاگیں۔ جی چاہا لگاؤں چڑیل کے دو چانٹے۔"

مگر صبیحہ کیا کرتی۔ روشن کے آتے ہی وہ کمرے میں بھاگ جاتی۔ یوں سب کے سامنے گھور کر دیکھتی تو نہ جانے وہ کیا سوچتے' دروازے کی آڑ سے مزے سے جی بھر کے دیکھ سکتی تھی۔ اب تو علاج کے لئے وہ بلاناغہ آنے لگے۔

اصغری خانم کچھ ایسی ترکیب چلتیں کہ صبیحہ کو پاس روک لیتیں اور بیچارے روشن تو ایسے جھینپو تھے کہ صبیحہ بھی شیر ہو گئی۔ انہیں ایک نظر بھر کے اپنی بھوری آنکھوں سے دیکھتی تو ان کے ہاتھ میں انجکشن کی سوئی کانپنے لگتی۔ وہ ہنس پڑتی تو

گھبرا کر بچوں کی طرح ناخن کترنے لگتے۔ تب وہ اور بھی دیدہ دلیر ہو جاتی۔

"ڈاکٹر صاحب ہماری بلی کا جی اچھا نہیں۔"

"کیا ہو گیا؟"

"پتہ نہیں ------ بیچاری کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔"

"اوہو ----- معلوم ہوتا ہے بیچاری کا دل ٹوٹ گیا ہے۔"

"ارے واہ۔ کیوں؟"

"آپ روٹھ گئی ہوں گی۔" وہ دبی زبان سے کہتے۔

"اجی ہاں' میں کیوں روٹھتی۔" صبیحہ کالی کالی پلکیں جھپکاتی۔

"تو پھر ڈرتی ہو گی آپ سے۔"

"واہ کیا میں اتنی ڈراؤنی ہوں۔"

"او بہادر؟"

"کالی کالی آنکھوں سے۔"

دونوں انگریزی میں نوک جھونک کئے جاتے تو اصغری خانم کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ بھلا گٹ پٹ کر کے بھی کہیں پیار کی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ موئی کافروں کی زبان میں "لفٹ رائٹ کوئک مارچ" کے سوا اور کیا معلوم ہوتا ہے؟ وہ ایک دم بیچ میں کود پڑتیں۔

"اے روشن میرے چاند ذرا میری بالو شاہیوں پر نیاز تو دے دے تیرے خالو میاں کی برسی ہے۔" وہ فوراً ہوشیاری سے رشتہ لگاتیں۔

"کون ہیں؟" روشن بوکھلا گئے۔

"آپ بھی حد کرتی ہیں اصغری خالہ۔ ان سے فاتحہ پڑھوا کر اپنی عاقبت خراب کرنے کا ارادہ ہے۔ بھلا انہیں کیا خبر کہ فاتحہ کس چڑیا کا نام ہے۔ ایک آیت بھی زیادہ ہو گی۔" صبیحہ اڑنے لگی۔

اچھا ملانی جی آپ بیچ میں نہ بولیں۔" روشن چڑ گئے۔

"ارے صاحب چھوڑیئے۔ ہمیں معلوم ہے آپ اور صمد بھیا میں کیا فرق

ہے وہ بھی تو صاحب بہادر بن گئے ہیں۔"

"خالہ جی آپ روشن سے فاتحہ پڑھوا رہی ہیں؟ صمد نے قہقہہ لگایا۔

"اے غارت ہو کل مونہو۔ لعنت ہو' موئے آج کل کے لونڈے ہیں کہ نگوڑے سب کے سب بے دین۔" صغرا خانم بالو شاہیوں کا تھال اٹھا کر دالان میں لے گئیں۔ مگر بچاری کی فکر دور نہ ہوئی۔

"اے توفیق جہاں۔"

"ہاں کیا ہے؟" توفیق جہاں نے پنکھے سے مکھی کو دھمکا کر جواب دیا------

"اے میں کہوں یہ آج کل کے لڑکوں کے نکاح کیسے پڑھے جاویں گے۔"

"کیوں۔"

"اے انہیں------ آمنتو بھی تو نہیں آتی' آمنت باللہ۔ ایک آیت ہوتی ہے جو نکاح کے وقت دولھا کو پڑھنی پڑتی ہے۔ جس میں وہ اقرار کرتا ہے کہ میں خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان رکھتا ہوں۔ اس آیت کو پڑھے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا۔

"قاضی جی بولتے جاتے ہیں اور دولہا دہراتا جاتا ہے۔ بس بس اب تو ایسے یہ نکاح ہو رہے ہیں۔" توفیق جہاں بولیں۔

"مگر اب اس نیاز کا کیا ہو؟" وہ فکر مند ہو گئی۔

"کیسی نیاز؟"

"ارے بھئی میں نے تو جھوٹ موٹ کہہ دیا تھا کہ ان کی برسی ہے۔ یہ منت کی نیاز ہے۔ لڑکا خود نیاز دے جب ہی پوری ہو گی۔"

"ارے چلو ادھر۔ ایسی کوئی منت نہیں ہوتی۔" توفیق جہاں نے ٹالنا چاہا۔

"نہیں جی تم تو کسی بات کو مانتی ہی نہیں ہو۔ خیر پھر سہی۔" اور وہ خود دوپٹہ سر پر منڈھ کر بدھ بدھ نیاز دینے لگی۔

دوسرے دن روشن آئے تو جھٹ پوچھا۔ "کیوں رے تو نے قرآن ختم کیا تھا؟"

"جی؟------ نہیں تو ایک بار انگریزی میں پڑھا تھا تھوڑا سا------ تو۔"
روشن ہکلائے۔

"ہے ہے یہ موئی لکڑ توڑ زبان میں کیسا قرآن؟ لڑکے دیوانہ تو نہیں ہوا۔"

"تو صمد بھیا نے کون سا پڑھ لیا ہے۔ ساری عمر انگریزی اسکولوں میں رہے۔ کالج میں فرصت نہ ملی۔ اس کے بعد انگلینڈ چلے گئے۔" مگر خود ہر رمضان کے مہینے میں پانچ قرآن ختم کرتی ہے۔ روزے نماز کی پابند تھی۔ حالانکہ صمد کہتے تھے۔ وہ نازک بدن بننے کے لئے فاقے کرتی تھی------ توبہ توبہ!

سوت نہ کپاس کولی سے لٹھم لٹھا! روشن کی آنکھوں سے دل کے راز کا پتہ بچے بچے کو چل چکا تھا۔ مگر زبان نہ جانے کیوں گنگ تھی۔ کبھی بیٹھے بیٹھے ایک دم آنکھوں میں غم کا اتھاہ سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا اور سر جھکا کر اٹھ کر چلے جاتے۔ صبیحہ کی طرف ایسی ترسی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے جیسے وہ کسی دوسری دنیا میں کھڑی ہو' درمیان میں فولادی سلاخیں ہوں اور کالے دیو کا پہرا۔ صبیحہ کے مکھڑے پر غرور اور اطمینان کا نور پھوٹنے لگا تھا۔ جیسے منزل پر پہنچ کر آرام سے چھاؤں میں بیٹھ گئی ہو۔ ساری انجانی کسک اور تنہائی مٹ کر گھروند! جگر مگر کرنے لگا ہو۔

مگر دقت یہ تھی کہ لڑکے کا یہاں کوئی ہے نہیں پھر پیغام کیسے منگوایا جائے۔ آج تو شادیاں ایسے ہی ہوتی ہیں کہ دو جنوں کا ایک دوسرے پر جی آگیا۔ دوستوں نے پیغام دیا' یاروں نے شادی کر دی۔ اصغری خانم کو ایسی ٹکڑہ توڑ شادیوں سے بھی انہوں نے رو پیٹ کر سمجھوتہ کر لیا تھا۔ پہلے پہل جب نصرت اور حلیقہ نے ایسی چٹ پٹ شادی کی تھی تو انہوں نے بڑا شور مچایا تھا۔ مگر پھر انہیں اپنی پالیسی نرم کرنا پڑی۔

ادھر روشن بھونڈو تھے ادھر صبیحہ بھی ذرا چنٹ ہوتیں۔ تو کبھی کا انہیں ڈکار چکی ہوتیں۔ کاش اسے کوئی چھوٹی موٹی پیاری سی بیماری لگ جاتی تو روشن اس کا علاج کرتے کرتے خود مرض مول لے بیٹھتے مگر اصغری خانم گھیر گھیر کر مرغی کو ڈربے میں پھانسے کی کوشش کرتیں مگر اپنے منہ کی کھا کر رہ جاتیں۔

"اے لڑکی تیرے سر میں آدھے سر کا درد ہو رہے تھے۔ علاج کیوں نہیں کرا لیتی ڈاکٹر سے؟" وہ صبیحہ کو رائے دیتیں۔
"اے واہ خالہ جی میرے سر میں کاہے کو ہوتا درد۔" وہ بگڑنے لگتی گدھی۔
"پہلے تو ہووے تھا۔ اب بھلی چنگی ہو گئی ہو تو مجھے نہیں خبر۔" وہ صبیحہ کی صحت سے جل کر کہتی۔ "دیکھ تو بیٹا روشن کیسی جھلس کر رہ گئی ہے بچی۔"
"ارے خالہ جی ان کی تو رنگت ہی سیاہ بھٹ ہے۔ کہئے تو کھال کھینچ کر دوسری چڑھا دوں پلاسٹک سرجری سے۔"
"جی ہاں بڑے آئے کھال کھینچنے والے۔ ہم کالے ہی بھلے۔"
"اوئی کالی کدھر ہے لونڈیا۔ ہاں گیہوں رنگت ہے۔" اصغری بوا پریشان ہو کر کہتیں۔
"جی ہاں ادھر کچھ دنوں سے امریکہ سے گیہوں کا بھی کالا ہی آ رہا ہے۔" روشن چھیڑتے۔
"ہاں بس ایک آپ ہی زمانے بھر میں گورے ہیں، ہونہہ پھیکے شلجم!" صبیحہ چڑ جاتی۔
"آپ تو نمک کی کان ہیں۔ چلئے کچھ تو مزہ آ جائے گا۔" وہ چپکے سے کہتے۔
صغرا خانم بدمزگی مٹانے کو جلدی سے بات بدلتیں۔ "اے کالی گوری رنگتیں سب اللہ کی دین ہیں پرسوں کہہ رہی تھی سر بھاری ہے ویسے تیرے بال بھی تو جھڑ رہے ہیں۔ بٹیا کوئی بال بڑھانے کی دوا بتاؤ۔"
"ارے خالہ جی بہت بال ہیں۔ ہاں کہئے تو دماغ کو بڑھانے کے دو چار انجکشن لگا دوں۔"
"آہا ہا بڑے آئے سلوتری جی۔" اور روشن کا چہرہ ہنستے ہنستے صبیحہ کے گلابی آنچل کو مات کرنے لگتا۔
صغرا خانم اس پچر پچر سے اداس ہو کر بڑی زور زور سے کراہنے لگتیں۔ ایک دن انہوں نے صمد کو گھیر کر بات کر ہی ڈالی۔

"اے بھیا کوئی پیغام نہ الغام۔" "کیسا پیغام؟"

"اے روشن کا ـــــــ اس سے کہو اپنی بہن بہنوئی سے پیغام بھجوائے۔"

"مگر خالہ جی روشن۔"

"ہاں ہاں بیٹے مجھے سب معلوم ہے۔ مگر اب زمانہ بدل گیا ہے۔ ہزاروں شادیاں ہو رہی ہیں۔ کب تک لڑکی بٹھائے رکھیں گے۔ توفیق جہاں کا دل کوئی دن اور کرام دے گا۔ پھر دونوں میں اللہ رکھے چاؤ بھی ہے۔"

"مگر ـــــــ خالہ جی۔"

"بیٹے تم اللہ رکھے سات سمندر پار ہے تمہیں کیا معلوم دنیا کتنی بدل گئی۔ سیدوں کی بیٹیاں کن کن کو گئیں۔ سرفراز میاں کی لڑکی نے تو زہر کھا لیا ـــــــ اب اللہ کی مرضی یہی ہے تو جہالت کی باتوں میں پڑنے سے کیا حاصل۔"

"مگر ـــــــ میں سوچوں گا۔" صمد میاں چکرائے سے جا کر باہر پڑ گے اس انقلاب کی انہیں امید نہ تھی۔ دنیا سے دور وہ کتنے جاہل رہ گئے جب ان کے بزرگ تک اتنے روشن خیال ہو چکے تھے۔ ان کا دل غرور سے بھر گیا۔ شام کی گاڑی سے انہیں سائنس کانفرنس میں شرکت کے لئے جانا تھا۔ اب وہاں سے لوٹ کر ہی سب کچھ ہو گا۔ ادھر اصغری خانم نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ یہاں بیٹی بیاہنی تھی۔ اس لئے توفیق جہاں کو کہہ سن کر پٹا لیا کہ صبیحہ بیکار وقت برباد کرنے کے اگر کچھ کام سیکھنے لگے تو کیسا رہے؟ طے ہوا کہ روشن میاں کی ڈسپنسری میں نرسنگ سیکھنے چلی جایا کریں۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور صبیحہ نرسنگ سیکھنے جانے لگی۔ جس کا سبق صبح سے لے کر رات کے سنیما کے آخری شو تک چلتا رہتا اور صبیحہ چست چالاک نرس کے بجائے دن بدن اس جانے پہچانے مرض میں کھو گئی جو جنم جنم سے مرد عورت کو سونپتا آیا۔ روشن کے سویٹر بنے جانے لگے اور کمرے میں ان کی قمیض' ان کے موزے بکھرے گئے۔ بس چودہ طبق روشن ہو گئے۔

جیسے یہ شکار گرتا ہے شکاری جو مکر گانٹھے جھاڑیوں میں دبکا ہوتا ہے ایک ہی جست لگا کر آ دبوچتا ہے اور گلے پر چھری رکھ دیتا ہے۔ اصغری خانم نے بھی سادی

بیماری دور پھینکی اور دھم سے اکھاڑے میں آن جمیں۔ جھپا جھپ جہیز سلنے لگا۔ دلیفوں پر سے لحاف توشک کے انبار اتار کر قلعی ہونے لگی۔ ڈیوڑھی پر سنار بیٹھ گیا کہ سامنے نہ بنواؤ تو موا اپلے تھوپ دے گا۔ بی سیدانی محلّے کی پوٹ سنبھال کر طوی چمپا او گوکھرو توڑنے لگیں۔ گھوکھرو کے ہر کنگورے پر لب بھر کے دعائیں دیتی جاتیں۔ گوئیاں سہاگ اور مزے یاد کر کے کاپیوں میں اتارنے لگیں کورسے دولہا اور سالونی دلہن پر گیت جوڑے جانے لگے۔

"اے بھئی باپ کا نام روشن تو بیٹے کا۔" صغرا خانم فکر مند ہو کر پوچھتیں۔

"جوشن۔" کوئی شوخ سہیلی چھیڑتی تو صبیحہ جل کر اس کی بوٹیاں نوچنے لگتی۔

"اے بھئی انہیں اپنی کلو رانی ہی پسند ہے تو تم لوگ کاہے کو جلی مرتی ہو۔" صغرا خانم ڈانٹتیں اور صبیحہ آنکھوں میں خوابوں کے جمگھٹے لئے نرسنگ سیکھنے بھاگ جاتیں۔

مگر کسے خبر تھی یہ گل کھلائے گی۔ پل بھر میں چمکتا سورج الٹا توا بن جائے گا۔ وہی روشن جو کل تک چودھویں کے چاند کو شرما رہے تھے۔ لوٹ پوٹ کر کھڑے ہوئے تو کالا دیو! اور اس کالے دیو نے پلک جھپکاتے میں اونچے اونچے محلوں کو چکنا چور کر دیا۔ صغرا خانم کے سارے نئے پرانے مرض ایک دم ان پر ٹوٹ پڑے۔ جب صمد میاں کانفرنس سے جم جم کر لوٹے تو گھر میں جیسے کوئی میت ہو گئی ہو۔ سناٹا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ صغرا خانم کا ایک کو کونا زمین تو ایک آسمان پر۔ زمرد کا محل ساتویں آسمان پر لرزا اور ایک دم پھس سے بیٹھ گیا۔ قلعی کی دلیفوں پر پھر لحاف توشک لد گئے۔ دھنک کی پنڈیاں الجھ کر جھونج بن گئیں۔ سنار ڈیوڑھی سے دھتکار دیا گیا اور جس نے سنا منہ پیٹ لیا۔

"آخر ہوا کیا ------ کچھ معلوم تو ہو۔" صمد میاں نے پوچھا۔

"ارے اس بجھیتی سے پوچھو۔ جو چڑھ چڑھ کے دیدے لڑانے جاتی تھی۔" توفیق جہاں نے زانو پیٹ لیا۔ "حرافہ"۔

کارساز

دوپہر تندور کی طرح تپ رہی تھی۔ ہوا دم گھوٹے نہ جانے کس غار میں دبکی بیٹھی تھی۔ ننگے پیڑ سوکھے ہاتھ پھیلائے بھیک منگوں کی طرح چپ چاپ کھڑے تھے۔ ایک سوکھا مارا کتا دیوار کے سائے میں بیٹھا اپنے زخم چاٹ رہا تھا۔

"قیامت کے دن سورج سوا نیزے پر اتر آئے گا اور زمین سینہ پھاڑ کر پگھلتی ہوئی آگ اگلنے لگے گی۔ تب گناہگار مونہہ کے بل گر پڑیں گے۔"

مگر مولوی رفاقت علی کیوں مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اوندھے مونہہ گر پڑے؟ وہ تو بڑے متقی اور پرہیز گار تھے انہیں تو کبھی کوئی گناہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ چھاجوں مینہ برستا ہو کہ آندھی اپنا تیہا دکھا رہی ہو، ان کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی۔

دم بھر میں لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح بلوں میں سے نکل کر جمع ہو گئے ----- مولوی صاحب ذبح کی ہوئی مرغی کی طرح تڑپ رہے تھے۔ پسینہ پرنالوں کی طرح بہہ رہا تھا۔ لوگ نئی نئی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ کوئی کہتا درد قولنج ہے کسی کی رائے تھی کہ دل کا دورہ پڑا ہے یا شاید لو یہ پھیل گئے۔ دھان پلن سے تو تھے بے چارے۔

اور اسی وقت فرشتہ رحمت کی طرح بچن بابو آ گئے فوراً موٹر رکی اور "ہٹو ہٹو" کہتے اتر پڑے۔ بچپن بابو میونسپلٹی کے الیکشن میں کھڑے ہوئے تھے۔ محلے محلے خاک چھانتے پھرتے تھے۔ مولوی صاحب کے محلے میں تو لوگ انہیں دیکھتے ہی نہایت ضروری کاموں میں مشغول ہو جاتے، دکانوں میں تالے پڑ جاتے اور مسجد میں

جماؤ ہونے لگتے، ٹھیٹ مسلمانوں کا محلہ تھا۔ جتنی جتنی ملک میں روشن خیالی بڑھتی جا رہی تھی، لوگ شدت سے فرقہ پرست ہوتے جا رہے تھے۔ لوگوں کو منانے میں بڑے ہل بیل لگانے پڑتے ہیں۔

بچن بابو نے موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا۔ انہوں نے مولوی صاحب کو اٹھا کر گھر پہنچایا۔ پوسٹ آفس سے فون کر کے ڈاکٹر کو بلوایا۔ بیگم آڑ میں کھڑی میلے آنچل سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ بچے ایک دوسرے کا مونہہ تک رہے تھے۔ مولوی رفاقت بڑے مرنجاں مرنج انسان تھے۔ لالہ جی کی ٹال پر باون روپے مہینے پر حساب کتاب لکھ دیتے تھے۔ بچوں کو قرآن پڑھا دیتے تھے۔ چھ بچوں اور بیوی سے لدی پھندی گاڑی نہ جانے کن طلسمی گھوڑوں کے بل پر گھسیٹ رہے تھے۔

ڈاکٹر نے آکر اس امر کی تصدیق کر دی کہ مولوی صاحب کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ حالت نازک ہے۔ ہلانے جلانے سے دم توڑ دیں گے۔ مگر بچن بابو نے لگامیں سنبھال لیں اور فوراً ایک ہسپتال کا بیڈ منگوایا۔ ہینڈل چلانے سے اوپر نیچے اٹھتا تھا ایک آکسیجن سلنڈر بھی احتیاطاً منگوایا، جسے دیکھ کر بیگم حواس باختہ ہو گئیں۔ بولیں "ہے ہے یہ موا بم کاہے کو آیا ہے؟"

سارا محلہ ٹوٹ پڑا، جیسے کوئی سرکس کا تماشا دیکھ رہا ہو۔ نیلی کنی کی سفید ساڑھی پہنے نرس نے آکر تو ٹھاٹ جما دیئے نہ جانے کہاں سے ایک فوٹوگرافر ٹپک پڑا، اور کھٹا کھٹ تصویریں اتارنے لگا۔ دوسرے دن اخباروں میں تصویریں نکل گئیں۔ جن میں بچن بابو ہیرو کا رول ادا کر رہے ہیں۔ ضرورت تو نہیں تھی۔ لیکن ایک ایسی بھی تصویر لے لی گئی جس میں ڈاکٹر مولوی صاحب کو آکسیجن دے رہے تھے اور بچن بابو نکی سنبھالے ہوئے تھے۔

شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بچن بابو زبردست اکثریت سے چناؤ جیت گئے محلے کا ایک ووٹ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہوا۔

مولوی صاحب اچھے ہو گئے مگر بچن بابو کی مہربانیوں میں فرق نہ آیا۔ اخباروں میں مولوی صاحب پر مضمون نکلنے لگے۔ ان کے انٹرویو چھپے "عربی اور

فارسی کا عالم فاقوں مر رہا ہے کیسی ناقدری ہے۔" ویسے مولوی صاحب میٹرک فیل بھی تھے۔ بچن بابو نے ان کی بیماری کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک فنڈ کھول دیا۔ اپنی جیب سے پانچ ہزار دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو فنڈ سے دس ہزار کا عطیہ بھی دیا اور ان کے سیکرٹری کا خط بھی آیا۔ بڑے بڑے دھن والوں نے دل کھول کر دیا۔ چالیس ہزار کا پرس گورنر صاحب کے ہاتھوں مولوی رفاقت کو ایک شاندار جلسے میں پیش کیا گیا۔

بچن بابو نے فنڈ جمع کرنے کے لئے بڑے جوش و خروش سے جلسے کئے۔ دلیپ کمار کو صدارت کرنے کے لئے آمادہ کر لیا اور شکیلا بانو بھوپالی کی قوالی کرائی۔ ہر جلسہ بہت کامیاب رہا۔ بچن بابو کا ایک فلیٹ خالی پڑا تھا۔ اس میں انہوں نے یوں یہ آفس بنا رکھا تھا۔ مولوی صاحب اس میں اٹھ آئے۔ چند برس میں ان کی کایا پلٹ ہو گئی۔ بچے انگریزی اسکولوں میں داخل ہو گئے بیگم نے تنگ پاجامہ چھوڑ کر ساڑھی پہننا شروع کر دی اور انہیں پردہ بھی چھوڑنا پڑا۔ کیوں کہ اب چھوٹے موٹے جلسے ان کی صدارت میں ہونے لگے تھے اور سوشل ورک وغیرہ کے سلسلے میں بہت گھومنا پڑتا تھا۔

مولوی صاحب کی تقریریں بڑی پابندی سے چھپتیں اور ریڈیو سے نشر کی جاتیں، جن کا لب لباب یہ ہوتا کہ ہم ایک ہیں اور ایک رہیں گے۔ کوئی اونچ نیچ کا سوال نہیں سب کی برابر کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ اقلیتوں کے نمائندے بھی آواز رکھتے ہیں۔

بچن بابو نے باقاعدہ ایک "رفاقت فنڈ" کا دفتر کھول رکھا تھا۔ ایک رسالہ بھی مولوی صاحب کی سرپرستی میں نکلنے لگا تھا جس کا ایک واحد مقصد "اردو بچاؤ" تھا یہ رسالہ اردو کی بقا کے لئے بڑے زور شور کی جدوجہد کر رہا تھا۔ بچن بابو "اردو بچاؤ سوسائٹی" کے روح رواں تھے۔

رفاقت فنڈ سے اردو ادیبوں کو انعامات دیئے جاتے تھے۔ لوگ تو الزام تراشی میں مزہ لیتے ہیں، بکواس کرتے تھے کہ سارے انعامات بچن بابو کے چمچوں کو ہی عطا

کیۓ جاتے ہیں۔ ان جلسوں میں بڑے بڑے فلمی ستارے موجود ہوتے تھے۔ فلمی پریاں بروشنز بیچتی تھیں اور جھولی پھیلا کر چندے جمع کرتی تھیں۔

مولوی رفاقت کی صحت بن گئی تھی۔ جسم بھاری ہو گیا تھا۔ تھوڑی سی توند بھی نکل آئی تھی، جو ان کی پوزیشن پر بہت جچتی تھی، ہاں بیگم کچھ زیادہ ہی بھر گئی تھیں ورزش کے لئے انہیں کلینک جانا پڑتا تھا۔

مسجد جانا تو بیماری کی وجہ سے چھوٹ ہی گیا تھا، مگر کبھی کبھی جمعہ کی نماز پڑھنے اور عید، بقرعید پر پابندی سے مولوی صاحب ضرور تشریف لے جاتے تھے۔ کبھی محلے میں چلے جاتے تو باقاعدہ جلوس نکل جاتا۔ وہاں کے رہنے والے فخر کرتے تھے کہ مولوی صاحب کبھی ان کے محلے میں رہا کرتے تھے۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ اتنا مرتبہ پا کر بھی غریبوں سے اتنے خلوص سے ملتے تھے۔

اس عرصہ میں مسز اندرا گاندھی تخت پر بیٹھ چکی تھی اور دن بدن ان کی ساکھ بڑھتی جا رہی تھی۔ مولوی صاحب ان سے کئی بار اقلیتوں کے نمائندے کی حیثیت سے "اردو بچاؤ" کے سلسلہ میں بڑی امید افزا ملاقاتیں کر چکے تھے۔ ان کے ساتھ کھنچی ہوئی تصویریں بڑے نمایاں ڈھنگ سے ان کے فلیٹ کے کونے کونے میں بجی ہوئی تھیں ان کے اخبار میں میڈم کی سیاسی نکتہ دانیوں، ان کی موروثی ذہانت اور دور اندیشی پر مدلل تبصرے چھپتے رہتے تھے۔ بھارت کا کلیان کرنے کے لئے قدرت نے ایک ناری کے روپ میں درگا کو بھیجا۔ انہوں نے ایک طویل نظم ان کی کارگزاریوں پر لکھی تھی جو کئی زبانوں میں ترجمہ کر کے دیس کے کونے کونے تک پہنچائی گئی جب وہ نظم مسز اندرا گاندھی کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے دہلی گئے۔ تو ٹیلی ویژن اور آکاش وانی نے بڑی خوبصورتی سے اس تاریخی واقعہ کو عوام کے مفاد کے لیے پیش کیا۔ بیگم بھی اس موقعہ پر موجود تھیں اور پورے وقت کیمرے کے لینس کو گھورتی رہیں۔

بیگم پر تو اس ملاقات کا نشہ چڑھ گیا ان کے ساتھ کھنچی ہوئی پردھان منتری کی تصویر سنہری فریم میں جڑ کر ڈرائنگ روم میں ایسی جگہ ٹانگ دی کہ ہر آنے

جانے والی کی نظر سب سے پہلے اسی پر پڑے۔ پھر وہ بڑی تفصیل سے ہر مہمان کو اس سہانی ملاقات کا ذکر سناتیں، ایسا شاندار نقشہ کھینچتیں کہ سننے والا بھونچکا رہ جاتا کچھ بدمزاج لوگ اس عظیم وقعہ کی روداد سن سن کر بور ہو چکے تھے اور بیگم کے پاس جاتے ہوئے کانپتے تھے مگر جب وہ اپنی نیم بار آنکھوں میں تقدس بھر کر کہتیں۔ "ہماری وزیراعظم ایک عورت نہیں، ایک معجزہ ہیں۔" تو سب جھوم اٹھتے۔ مولوی صاحب کی تو بات ہی اور تھی، خود بیگم کی اتنی دور دور پہنچ ہو گئی تھی کہ سفارش مانگنے والوں کے ٹھٹ لگے رہتے تھے، سنا تھا وہ بڑے بڑے ایوارڈ اور پدم شری وغیرہ تک دلوانے لگی تھی۔

اسی وقت مولوی رفاقت صاحب کو دل کا دورہ پڑا۔ کچھ کوڑھ مغز لوگوں کا خیال تھا کہ دل کا دورہ مولوی رفاقت صاحب پر بچن بابو نے "مصلحتاً" پڑوایا تھا۔ چندہ جمع کرنے کے لئے نئے مواقع پیدا کرنے کے لئے ایک عدد دورے کی اشد ضرورت لاحق ہو گئی تھی۔ کیسے کم ذوق ہوتے ہیں لوگ کسی کی بہتری ہوتے دیکھ کر جل کر موںڈا ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی سرمایہ دار کا کاروبار ترقی کرتا ہے تو کیا ملک کی ترقی نہیں ہوئی؟ بمبئی کی شان بڑھی کہ نہیں؟ اس میں ان عمارتوں کا کیا قصور لاکھوں انسان فٹ پاتھ پر یا جھونپڑے ہی میں رہتے ہیں اور بھئی یہ بھی قسمت کی بات ہے کہ ملک کا زیادہ تر منافع مٹھیوں تک رہ جاتا ہے۔

خدا جسے چاہے دولت دے جسے چاہے عزت دے، ایک چنا ہوا طبقہ اللہ کو پیارا ہے تو اس میں جل مرنے کی کون سی بات ہے؟

بچن بابو نے مولوی رفاقت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ کیا یہ مسلم طبقہ کی خوش حالی کا ثبوت نہیں؟ اگر اسی طرح لوگ ہریجنوں اور آدی باسیوں کی دیکھ ریکھ کریں تو ملک کا سب سے اہم سوال چٹکی بجانے میں حل ہو سکتا ہے۔ مگر بچن بابو جیسے دیش سیوک ہوں تب نا۔ آج مولوی صاحب کے دن پھرے، کل پورے طبقے کے دلدر دور ہو جائیں گے۔

اس دورے میں مولوی صاحب شہر کے بہترین نرسنگ ہوم میں رہے

اخباروں میں ان کی بیماری کی خبر پڑھ کر لوگ ٹوٹ پڑے بڑے بڑے عہدہ دار منسٹر تک عیادت کو آئے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ گورنر صاحب بھی لیڈی گورنر کے ہمراہ تشریف لائے۔ جلنے والوں نے کہا صرف گورنر صاحب ہی تشریف لائے لیڈی صاحبہ نہ آسکیں۔ کچھ سرپھروں نے کہا۔ نہ گورنر صاحب تشریف لائے نہ لیڈی گورنر۔ سب پروپیگنڈہ ہے بے پر کی اڑائی گئی ہے۔

بڑے زور شور سے جلسے ہوئے چندہ جمع ہوا۔ فلمی شو ہوئے دو دو سو کے ٹکٹ بکے۔ سوونیئر میں اشتہار الگ جمع ہوئے۔ فلمی ستاروں نے خوب ہُلا گلا کیا۔ پتہ چلا۔ اس سودے میں گھاٹا رہا کیونکہ بڑے ستارے حسب عادت غوطہ دے گئے اور چھوٹے فنکاروں پر پبلک نے چپلیں برسائیں۔ ایک گمنام سی فلمی پری نے ایسا طوفانی رقص پیش کیا کہ مولوی صاحب اگر اپنے پرانے محلے میں ہوتے تو ضرور کہتے: لاحول ولاقوۃ! مگر انھوں نے آنسو بھری آواز میں سب کا شکریہ ادا کیا' پبلک کے غل غپاڑے میں کوئی نہ سن سکا۔ وزیر اعظم نے اپنے فنڈ سے بیس ہزار دیئے اور عیادت نامہ بھی ارسال کیا۔ جسے بیگم رفاقت صاحب آنے جانے کو کسی بہانے سے دکھا دیتیں۔

پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ فرقہ پرستی ہمارے خون میں رچ بس چکی ہے۔ لوگوں کو بچن بابو اور مولوی رفاقت کا بھائی چارہ پھوٹی آنکھ نہ بھایا۔ انھوں نے ان کے کان بھرنے شروع کیے۔ سب سے زیادہ انھوں نے بیگم کو بھڑکایا۔ وہ غریب فوراً بھڑک گئیں۔ عورت ذات کانوں کی کچی ہوتی ہے انھوں نے کہا کہ "رفاقت فنڈ" میں مال گول ہو رہا ہے۔ بچن بابو مختلف ناموں کے کاروبار چلا رہے ہیں۔ چھوٹی موٹی فیکٹریاں کھول رہے ہیں۔ فلیٹ خرید رہے ہیں۔ مولوی صاحب کے نام پر لوٹ مچا رکھی ہے کئی سنیما ہال خریدے ہیں۔ جن میں مولوی صاحب کا کہیں ذکر نہیں۔ وہ تو نرے الو ہیں' جنھیں تو کچھ خبر ہی نہیں۔ مولوی صاحب نے بیگم کے تقاضوں سے تنگ آکر بچن بابو سے حساب پوچھ لیا۔ کچھ دن تک تو وہ آئیں بائیں شائیں کر کے ٹالتے رہے پھر ایک دم برا مان گئے بڑی تو تو میں میں ہوئی۔ بچن بابو بری طرح روٹھ

گئے۔ مولوی صاحب کے چھکے چھوٹ گئے۔

"رفاقت فنڈ" گھاٹے میں جانے لگا۔ سارا غصہ بیگم پر اترا۔

"اری نیک بخت، خواہ مخواہ اڑچن ڈالو دی۔" انہوں نے بیگم کی ٹانگ لی۔

"بچن بابو خفا ہو گیا۔ اب کیا ہو گا؟"

"ہو جانے دو خفا۔ کیا مرغ نہ ہو گا تو صبح نہ ہو گی۔" وہ بولیں۔ "افتخار بھائی کہتے ہیں۔ گاڑی چل نکلی ہے اب روکے نہ رکے گی۔ جیسے اللہ نے ہمارے دن پھیرے ویسے سب کے پھیرے اور پھر افتخار بھائی اپنے ہیں۔"

"ارے چل موئے! کون سا فراڈ؟ بڑا فراڈ کا بچہ! بیگم بولیں۔ مگر مولوی صاحب نے دونوں کو ٹھنڈا کیا۔ اگر گندگی اچھلنے لگی تو پیڑا ہو جائے گا بھڑ کے چھتے کو چھیڑنا ٹھیک نہیں۔

بڑی بیٹی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی تھی۔ بیگم کے دل میں ہول اٹھ رہے تھے۔ دولہا کو ستر ہزار گھوڑے جوڑے کی دینا طے پایا تھا۔ راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ بس بچی کی شادی پر انہوں نے جا کر بچن بابو کے پاؤں پکڑ لئے۔ جو ناچاقی ادھر ادھر کے لوگوں نے کرا دی تھی۔ وہ خلیج بنتی جا رہی تھی۔ بیگم نے الٹی میٹم دے دیا کہ اگر بچن بھیا شادی میں نہیں بیٹھے تو برات اٹھوا دیں گے اور بچی کو زہر دے دیں گے۔ آخر نور جہاں ان کی منہ بولی بیٹی تھی۔ بچن بابو رو پڑے۔

ایسا جی کھول کر انتظام کیا کہ لوگ عش عش کرنے لگے۔ کیا ہنگامہ رہا ہفتہ بھر چار دن تک بدیسی شراب پانی کی طرح لنڈھائی گئی۔ باوجود اس قحط ماری کے سینکڑوں آدمی صبح شام ترمال اڑاتے رہے۔ عین شادی کے دن کو معاملہ بالکل شہنشاہی رہا۔ اپنی پوزیشن کا کچھ تو فائدہ یار دوستوں کو بھی ملنا چاہئے۔ دیا رام جی جو سیل ٹیکس کے افسر تھے۔ انہوں نے کیٹرنگ کا انتظام اپنے ذمے لے لیا۔ شہر کے چند بڑے بڑے ہوٹلوں سے دنیا بھر کی نعمتیں حاضر ہو گئیں۔ اتنا لذیذ اور بافراط کھانا تو دوسری جنگ عظیم سے پہلے بھی شاید ہی کسی ایک دسترخوان پر نظر آیا ہو۔ سارا گھر بجلی کے قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔

چند فسادیوں نے رنگ میں بھنگ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ شادی میں قانوناً مقرر کی ہوئی تعداد سے دس گنا مہمان تھے۔ بدتمیزوں نے موٹریں گن ڈالیں اور پولیس تک پہنچ گئے بڑی بے عزتی ہو گی۔ مولوی صاحب نے قسمیں کھا کھا کر اخباروں میں تردید کی مگر کافی ہلڑ مچا۔ پھر جیسے سارے ہنگامے اٹھتے ہیں اور خود بخود بیٹھ جاتے ہیں، یہ ہنگامہ بھی بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔ اگر اس وقت مولوی صاحب کے ساتھ . بچن بابو اور ان کے بارسوخ دوست نہ ہوتے تو غریب الٹے ٹنگ جاتے۔ اللہ رحیم و کریم ہے۔ وہ سب کے عیب ڈھکتا ہے۔ اخبار تھوڑے دن چیخ چلا کر دم توڑ گئے، ورنہ سنا تھا وزیر اعظم ننگی تلوار ہیں۔ کسی کو نہیں بخشتیں۔ لیکن بچن بابو نے بڑے بڑے زہریلے ناگ کھلائے تھے اور یار دوستوں کو بھی صاف بچا لاتے تھے۔ دراصل ان ہی دنوں ایمرجنسی لگی تھی۔ اخباروں کے گلے گھٹ رہے تھے۔ صرف وہ اخبار رنگ جما رہے تھے جو ایمرجنسی کے گن گانے کو تیار تھے نہ جانے کیسے بچن بابو نے مولوی صاحب پر کئے جانے والے اعتراضات کو اقلیت کے خلاف پروپیگنڈے کا روپ دے کر ساری مخالفتیں دبا دیں۔

اسی رات مولوی صاحب نے ایمرجنسی پر ایک شاندار نظم لکھی جس میں انہوں نے اس نئے قانون کو ملک کی قسمت کی روشن ترین کھڑکی سے تعبیر دی۔ جس کے ذریعے آسیبی لعنتیں دور ہوئیں اور جنتی نعمتیں اندر آئیں۔ ملک کے دشمن اور انسانوں کا خون چوسنے والے اسمگلروں، ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں کو کیفرِ کردار کو پہنچا دیا گیا اور پچھڑے ہوئے طبقے کے نمائندوں اور اقلیتوں کے حقوق کے ساتھ انصاف ہوا۔ ان کے حق ان کو مل رہے ہیں۔ غریبی تیزی سے غائب ہو رہی ہے اور عام انسان خوب پھل پھول رہا ہے۔

اسی شام انہوں نے اپنے نوکر چھوٹو کو چھڑی سے اتنا مارا کہ وہ ادھ مرا گیا اس نے بیگم کے کانوں کی بالیاں چرائی تھیں۔ چھوٹو کو پولیس لے گئی۔ اور مال اگلوانے لگی-----

رات کو جب ان کی بیٹی صغریٰ اپنی سہیلی کی پارٹی سے لوٹی تو اس کے کان

میں اپنی بالیاں جگمگاتی دیکھ کر بیگم کو پسینہ آ گیا۔

مگر اب کیا ہو سکتا ہے بیگم؟ کیس پولیس کے ہاتھ میں چلا گیا۔ بڑی بدنامی ہو گی۔"

مولوی صاحب نے سمجھایا۔

بیٹی کی شادی تو دھوم دھام سے ہو گئی۔ مگر بیگم کچھ اکھڑ گئیں۔ ان پر خدا جانے کیوں ایک دم جہالت کا بھوت سوار ہو گیا۔ شادی میں بڑے ہی پھوہڑپن اور کوتاہ اندیشی کا ثبوت دیا۔ اول تو باہر ہی نہ نکلیں، ہوسٹس کی غیر موجودگی میں ظاہر ہے۔ محفل سونی اور بے رنگ رہی۔

بچن بابو کی گرل فرینڈ نرملا کھنہ نے اگر مورچہ نہ سنبھال لیا ہوتا تو بھد اڑ جاتی مسز بچن مونہہ تھوتھائے مسز رفاقت کی پارٹی میں شامل رہیں۔ نرملا کھنہ نے ہر کمی کو پورا کر دیا۔

شادی کے بعد اور ہنگامے ٹھنڈے پڑ گئے۔ مگر مولوی صاحب بچن بابو کی بات کے قائل ہو گئے کہ بغیر ایک حسین اور جوان ہوسٹس کے ان کی پرسنیلٹی نہیں چمک سکتی۔ یہ بیگم کے بس کا روگ نہیں۔ کافی سیٹ بیک کا اندیشہ ہے۔ بیگم کا سلیقہ گھر کے دائرے تک محدود رہا ہے۔ ہائی سوسائٹی میں وہ الٹ جاتی ہے اور مولوی صاحب پر شبہ کرنے لگتی ہے۔ کہیں نہ کہیں ایسا جھول ڈال دیتی ہے کہ اپر کلاس کے لوگ کھٹک جاتے ہیں۔ ملگجا تیلی گوٹ کا پرانا پاجامہ پہنے بادلوں کی طرح دوڑتی پھریں۔ اگر نرملا کی طرح کاسنی شرارے والا جوڑا پہن لیتیں تو خاصی جم جاتیں۔

کتنی تعلیم یافتہ اور حسین لڑکیاں شادی کے مارکیٹ میں طاق پر رکھی سڑ جاتی ہیں۔ کوئی نوکری کے بھاری بھرکم دولہا کا انتظار کرنے لگتی ہیں۔ اسکولوں اور دفتروں کی نوکریں بور کر دیتی ہیں۔ لیکن پرائیویٹ سیکرٹری ٹائپ کی نوکریاں کافی دلچسپ اور باعزت سمجھی جاتی ہیں۔ بہت سے سمجھ دار لوگ ایک آدھ فلیٹ گھر کے علاوہ بیوی سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ جہاں یار دوستوں کی خاطر وغیرہ میں بڑی سہولت

رہتی ہے اس فلیٹ کو جو اکثر خالی پڑا رہتا ہے کسی جاذب ہوسٹس کے وجود سے سنوار دیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں بزنس کی بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو گھر میں نہیں کی جاتیں۔ پینے پلانے کی دعوتوں میں جب کچھ یار دوست ترنگ میں آجاتے ہیں' تو بیوی بچوں کی موجودگی میں بات کرنا مناسب نہیں رہتا۔

بچن بابو کی رائے سے مولوی صاحب نے ایک فلیٹ نرملا کی جگری دوست سروج بھاٹیہ کے نام سے لیا اور فرنش بھی سروج کے ذوق کے مطابق کرا دیا۔ بیگم عموماً" پینے پلانے کی محفلوں میں بادھا ڈال دیتی تھیں۔

"کیوں جی' یہ ہوا اور کنی چڑھائے گا۔ مرکھنے ہاتھی کی طرح جھوم رہا ہے۔" وہ کہتیں اور مولوی صاحب بڑی مشکل سے انہیں ٹال دیتے۔ "ارے بھائی کاغذ کا کوٹا ملتا تھا۔ اس کا بڑا حصہ بلیک میں بیچ دیا جاتا تھا۔ اسی سے تو اخبار کا خرچ نکلتا تھا۔ جو زیادہ تر مفت بانٹا جاتا تھا۔

سروج جس اسکول میں پہلے کام کرتی تھیں۔ وہ ایک تو پارٹ ٹائم جاب تھا۔ اور گھر سے بہت دور پڑتا تھا۔

سروج بھاٹیہ کمال کی ہوسٹس ثابت ہوئیں۔ مولوی صاحب کے دوست احباب کا دائرہ کافی پھیل چکا تھا۔ بڑی بڑی کمیٹیوں پر پہنچ گئے تھے۔ ان کی گرل فرینڈ برابر کی حق دار مان لی گئیں۔ بیگم کو لوگ بھول بیٹھے۔ مس سروج بھاٹیہ بالکل منسٹروں کی بیگموں کی طرح صدارت کرنے لگی۔ اسکولوں کالجوں میں انعامات بانٹنے اور لیکچر دینے لگی-----

بیگم بہت بدلیں۔ مگر مولوی صاحب نے سختی سے سمجھایا کہ سروج بھاٹیہ کا وجود ان کی پوزیشن قائم رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ بے چاری بیگم رو پیٹ کر بیٹھ رہیں۔ بیٹیاں بیاہ دی تھیں۔ لڑکے عموماً" ولایت کے چکروں میں رہتے۔ دھند دھار فلیٹ پر پڑی مکھیاں مارا کرتی تھیں۔ ساری ہوحق سروج بھاٹیہ کے فلیٹ میں ہوتی خود ان کی بیٹیاں ان سے کترانے لگیں۔ وہ جب بھی میکے آتیں۔ بیگم مس سروج کا دکھڑا رونے لگیں۔ جبکہ دوسرے فلیٹ میں رنگا رنگ کے ہنگامے رہتے

تھے بڑے کا۔ آدمی جمع ہوتے تھے' واں بیٹیوں کو اپنے شوہروں کا مستقبل سنوارنے کی امیدیں تھیں۔ اس لئے وہ پاپا کی گرل فرینڈ کے ارد گرد منڈلایا کرتیں۔

مولوی صاحب کا ایک پاؤں دہلی میں رہتا تھا۔ بیس نکاتی پروگرام کامیاب بنانے میں وہ سر پیر سے جٹے ہوئے تھے۔ یوتھ کانگریس کے بڑے زبردست حمایتیوں میں گنے جاتے تھے۔ وہی یوتھ کانگریس جو مستقبل کی تقدیر سنوارے دے رہی تھی۔ جو دیش کی کایا پلٹ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی وہی سنجے گاندھی جنہیں ورثے میں قوم کی خدمت کا جذبہ ملا تھا۔ مولوی صاحب سے سنجے جی بڑے بے تکلف تھے۔ جب ملتے پیٹھ پر دھپ مار کر نہایت پیار سے کہتے "ہیلو ایڈیٹ کیا حال چال ہے مولوی!"

"آپ کی دعا ہے۔" مولوی صاحب کھکھیاتے۔

نس بندی پر ان کی نظمیں باقاعدگی سے چھپا کرتی تھیں۔ ان میں سے یوتھ کانگریس کی کارگزاریوں کا نمایاں طور پر ذکر ہوتا' جن کے ناخدا سنجے گاندھی تھے جو دیکھتے دیکھتے دیس پر خدا کی رحمت بن کر طاری ہو گئے تھے۔ سروج بھاٹیہ نے رخسانہ سلطانہ سے بہناپا جوڑ لیا تھا۔ دونوں مل کر دیس سدھار کے پروگرام بنایا کرتی تھیں۔

بڑے زور شور کی محفل جمی تھی۔ مس سروج بھاٹیہ کا جنم دن تھا۔ کاگ پر کاگ اڑ رہے تھے۔ دور چل رہے تھے۔ جب سے ڈاکٹروں نے رائے دی تھی۔ مولوی صاحب منہ جھٹا لنے لگے تھے اور دو چار پیگ لے لیا کرتے تھے۔

"کیا رائے ہے؟" بچن بابو نے پوچھا۔

"کس بارے میں؟"

"یہ جو مارچ میں الیکشن ہو رہے ہیں۔"

"میڈم اپنی کامیابی کے پورے یقین کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتیں۔"

"مگر الیکشن کی اس وقت کیا ضرورت ہے۔"

اس الیکشن سے وہ صرف یہ ظاہر کرنا چاہتی ہیں کہ ان کی پوزیشن کتنی محفوظ ہے-----"

”اور جو کانگریس ہار گئی تو؟“
”کل آپ کہیں گے سورج مغرب میں نکلا تو؟“
”مگر دشمنوں کو آزاد کر دیا ہے یہ کہاں کی عقلمندی ہے؟“
”ارے ان دشمنوں میں دم نہیں کاٹھ کے بھی ساتھ مل کر ہار چکے ہیں-----“

سب نے مس سروج سے گانا سنانے کی فرمائش شروع کر دی۔ اور بات ٹل گئی۔

مولوی صاحب بیٹھے اگلے شمارے کا ایڈیٹوریل لکھ رہے تھے۔ قرآن اور حدیث کے حوالوں سے انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ اسلام نس بندی کا حامی ہے۔ بڑے معرکے کا مضمون بندھ رہا تھا کہ بچن بابو بوکھلائے ہوئے آئے بال بکھرے ہوئے کپڑے گرد آلود، حواس گم۔

”کچھ موسم کی بھی خبر ہے۔“

”کیا ہوا؟“

”وہ جس کا خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ رائے بریلی سے سیدھا چلا آ رہا ہوں-----“

”اچھا؟“

”میاں جی، کانگریس کا تختہ ٹوٹ گیا۔“

”اماں گھاس کھا گئے ہو؟ بریلی تو میڈم کا گڑھ ہے۔“

”ارے بھائی، لوگ تو دیوی جی کا نام سننے کو بھی تیار نہیں۔ دیکھئے نا میری کیا مٹی پلید کی ہے۔ موٹر کے شیشے توڑ ڈالے بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔“

”تو تم خواہ مخواہ حواس باختہ ہوئے جا رہے ہو۔“ ارے دو چار غنڈے اودھم مچا رہے ہوں گے۔“

”سارا ملک غنڈہ گردی پر تلا ہوا ہے خاک ڈالئے اس ایڈیٹوریل پر۔ یہ اب نہیں چلے گا۔“

"مگر پہلی قسط تو پریس میں گئی' اور چھپ بھی گئی' تم خواہ مخواہ ذرا سی بات پر ہول کھانے لگتے ہو۔"

"دیکھیے مولوی صاحب میں ذمے دار نہیں۔" بچن بابو ایک دم اٹھ کر چل دیئے۔

اور ایوننگ نیوز میں آ گیا کہ بچن بابو نے جنتا پارٹی جوائن کر لی۔ مولوی صاحب کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ لشتم پشتم بچن بابو کے ہاں دوڑے گئے۔"

"آپ کا کیا ہے' مولوی صاحب۔" وہ بولے۔ "آپ اقلیت کے نمائندے ہیں آپ کی تو ہر حکومت میں کھپت ہو جائے گی ذرا سے الٹ پھیر سے کام بن جائے گا۔ مصیبت تو میری ہے کیونکہ میں تو دیوی جی کی ناک کا بال تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یوں میری ساری دوڑ بھاگ خاک میں مل جائے گی۔"

اور مولوی صاحب نے بڑی تیزی سے الٹ پھیر شروع کر دی۔ ایڈیٹوریل پھاڑ دیا گیا۔ مشین پر چڑھا ہوا شمارہ راتوں رات جلا دیا گیا۔ ساری نقصان دہ تصویریں گھر کے کونے کونے سے اتاری گئیں۔ ان کی گھر میں موجودگی خطرے سے خالی نہ تھی۔ بیگم نے سنہرے فریم میں جڑی میڈم کی اور اپنی تصویر کھسوٹ کر مدینہ شریف کا رنگین فوٹو لگا دیا۔

دوسرے دن ایک بہت بڑے جلسے میں مولوی صاحب نے ایمرجنسی کی درندگی پر مدلل تقریر کی اور جنتا پارٹی کو ڈیموکریسی کا محافظ' عوام کا ہمدرد اور انسانیت کا علمبردار ثابت کر دیا۔

اور جنتا پارٹی نے انہیں لپک کر فوراً گلے لگا لیا۔

اللہ تعالیٰ بڑا کارساز ہے۔ وہ سب کی ناؤ پار لگا دیتا ہے۔
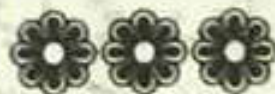
بدن کی خوشبو

کمرے کی نیم تاریک فضا میں ایسا محسوس ہوا جیسے ایک موہوم سایہ
آہستہ دبے پاؤں چھمن میاں کی مسہری کی طرف بڑھ رہا ہے۔
سائے کا رخ چھمن میاں کی مسہری کی طرف تھا۔ پستول نہیں شاید حملہ آور
کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ چھمن میاں کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ انگوٹھے اکڑنے
لگے۔ سایہ پیروں پر جھکا۔ مگر اس سے پہلے کہ دشمن ان پر بھرپور وار کرتا۔ انہوں
نے پول جمپ قسم کی ایک زقند لگائی اور سیدھا ٹیٹوئے پر ہاتھ ڈال دیا۔
"چیں" اس سایے نے ایک مری ہوئی آہ بھری اور چھمن میاں نے غنیم کو
قالین پر دے مارا۔ چوڑیوں اور جھانجھوں کا ایک زبردست چھناکا ہوا۔ انہوں نے
لپک کر بجلی جلائی۔ حملہ آور سٹ سے مسہری کے نیچے گھس گیا۔
"کون ہے بے تو" چھمن میاں چلائے۔
"جی میں حلیمہ"
"حلیمہ؟ اوہ!" وہ ایک دم بھس سے قالین پر بیٹھ گئے۔
"یہاں کیا کر رہی ہے؟"
"جی کچھ نہیں"
"تجھے کس نے بھیجا ہے۔ خبردار جھوٹ بولی تو زبان کھینچ لوں گا۔"
"نواب دلہن نے؟" حلیمہ کانپی۔

"اف پیاری اور ان کی جان کی دشمن!" ایک دم انکا دماغ قلانچیں بھرنے لگا۔ کئی دن سے امی انہیں عجیب عجیب نظروں سے دیکھ کر نایاب بوبو سے کانا پھوسی کر رہی تھیں۔ نایاب بوبو ایک ڈائن ہے کمبخت۔ بھائی جان بھی گستاخ نظروں سے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ان سب کی ملی بھگت معلوم ہوتی ہے۔

نوابوں کے خاندان میں کیا کچھ نہیں ہوا کرتا۔ چچا دادا نے کئی بار ابا حضور کو سنکھیا دلوانے کی کوشش کی۔ بدمعاش ان کی جان کو لگا دیئے کہ جائیداد پر قبضہ کر کے سب ہضم کر جاتیں۔ رفاقت علی خان کو ان کے سگے ماموں نے زہر دلوا دیا' خود ان کی چہیتی لونڈی کے ہاتھوں' لعنت ہے۔ ایسی جائیداد پر۔

شاید پیاری امی اپنی ساری جائیداد بڑے صاجزادے کو دینا چاہتی ہیں کہ اپنی بھتیجی بیاہ کر لائی ہیں نا' اس لئے اس کی جان کی دشمن ہو رہی ہیں۔

چمن میاں کو جائیداد سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسامیوں کی ٹھکائی کرنا۔ انہیں گھر سے بے گھر کر کے جیسے تیسے لگان وصول کرنا' ان کے ڈھور ڈنگر نیلام کروانا انہیں وحشت ہوتی تھی ان حرکتوں سے۔

اف دنیا میں کسی کا بھروسہ نہیں۔ اپنی ماں اگر جان کی دشمن ہو جائے۔ ویسے ہی ہر وقت ٹوکتی رہتی ہیں۔ یہ نہ کرو' وہ نہ کرو' اتنا نہ پڑھو' اتنا نہ کھیلو' اتنا نہ جیو۔

"چاقو کہاں ہے؟" چھمن میاں نے کہنیوں کے بل جھک کر پوچھا۔

"چاقو"

"ہینڈس اپ" چھمن میاں نے جاسوسی انداز میں کہا۔

"ایں" حلیمہ چکرائی۔

"الو کی پٹھی ہاتھ اوپر۔"

حلیمہ نے ہاتھ اوپر اٹھائے تو اوڑھنی پھسل گئی۔ جھینپ کر اس نے ہاتھ دبوچ لئے۔

پھر وہی بدمعاشی۔ ہم کہتے ہیں ہاتھ اوپر۔"

"اوں کائیکو؟" وہ اٹھلائی۔
"کائیکو کی بچی۔ چاقو کہاں ہے!"
"کیسا چاقو؟" حلیمہ چڑ گئی۔
"تو پھر کیا تھا تیرے ہاتھ میں!"
"کچھ بھی نہیں' اللہ قسم کچھ بھی نہیں تھا۔"
"تو پھر---- پھر کیوں ہے یہاں۔"
"نواب دلہن نے بھیجا ہے۔" حلیمہ نے دبی زباں سے کہا اور آنکھیں جھکا کر اپنی نتھنی کا موتی گھمانے لگی۔
"کیوں؟" بھمن میاں سہم گئے۔
"آپ کے پیر دبانے کے لئے۔" وہ مسہری سے ٹک گئی۔
"لاحول ولا قوہ--
------ چل بھاگ یہاں سے۔" انہوں نے حلیمہ کی شریر آنکھوں سے گھبرا کر کہا۔
حلیمہ کا چہرہ لٹک گیا۔ ہونٹ کانپے اور وہ قالین پر گھٹنوں میں سر دے کر پھوٹ پڑی۔
"اوہو' رو کیوں رہی ہے۔ بیوقوف گدھی کہیں کی۔"
مگر حلیمہ اور رونے لگی۔
"حلیمہ پلیز حلیمہ------ خدا کے لئے رو مت اور جا------ ہمیں صبح کالج ذرا جلدی جانا ہے۔"
حلیمہ پھر بھی روئے گئی۔
دس برس ہوئے تب بھی حلیمہ اسی طرح روئے جارہی تھی۔ اس کا باپ اوندھے منہ لیٹا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ مگر وہ خون بہت لال تھا۔ اس میں گلابی گلابی گوشت کے ٹکڑے سے ملے ہوئے تھے۔ جو بابا روز بلغم کے ذریعے اگلا کرتا تھا۔

اسے کلیجے سے لگائے جھوم جھوم کر بین کر رہی تھی۔ پھر سب نے ابو کو سفید کپڑوں میں لپیٹا اور ہسپتال لے گئے۔ لوگ ہسپتال جا کر پھر نہیں لوٹا کرتے۔

اور اس دن بھی وہ اسی طرح روئے جا رہی تھی جس دن اس کی اماں نے اسے نواب دلہن کی پٹی تلے ڈال کر اناج سے جھولی بھر لی تھی اور جاتے وقت پلٹ کر بھی نہ دیکھا تھا۔

غلام گردش کے احاطے میں حلیمہ جھوٹن کھا کر پلتی رہی۔ اسے نواب دلہن کے دالان تک رینگ کر آنے کی اجازت نہ تھی۔ گندگی اور غلاظت میں وہ مرغیوں اور کتے کے پلوں کے ساتھ کھیل کود کر بڑی ہوئی۔

بے حیا موٹی حلیمہ جیتی گئی۔ نایاب بوبو کا دس بارہ برس کا لونڈا جبار کیا دھواں دھواں موئی کو پیٹا کرتا تھا۔ کبھی چمٹے سے پیر داغ دیتا، کبھی آنکھوں میں نارنگی کا چھلکا نچوڑ دیتا کبھی خالہ کی نسوار کی چٹکی ناک میں چڑھا دیتا۔ حلیمہ گھٹنوں بیٹھی مینڈکی کی طرح چھینکتی رہتی۔ سارا گھر ہنس ہنس کر دیوانہ ہو جاتا۔

اب بھی ستانے سے باز نہیں آتا تھا۔ ڈیوڑھی پر کچھ دینے گئی۔ چٹکی بھر لی نتھنی پکڑ کے ہلا دی۔ کبھی چوٹی کھینچ لی۔ بڑی چلتی ز٭قم تھا۔ نواب صاحب کا تخم تھا نا۔ ان کا بڑا منہ٭ چڑھا تھا۔

نایاب بوبو ایک باندی تھیں۔ کسی زمانے میں بڑی دھار٭دار، نواب صاحب یعنی بجھمن میاں کے والد ان پر بری طرح لٹو ہو گئے۔ وقتاً فوقتاً نکاح کی دھمکیاں بھی دے دیا کرتے تھے مگر وہ ایک٭ گھاگ تھیں۔

باندی کا نکاح ہو جائے۔ چاہے نہ ہو، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی سرخاب کے پر نہیں لگ جاتے خاندانی نواب زادیاں مر جائیں گی۔ ساتھ نہ بٹھائیں گی۔ قاضی کے دو بولوں میں اتنا دم ٭زرود نہیں کہ چٹانوں میں سوراخ کر دیں یا دال روٹی کے سوال کو حل کر دیں۔

نایاب بوبو کے محل میں بڑے ٹھاٹ٭ تھے۔ بجائے بیگم کی سوت بنے کے وہ نہایت جانفشانی سے کوشش کر کے ان کی مشیر خاص گوئیاں بن گئیں اور نواب
جانفشانی

صاحب پر کچھ ایسا جادو کا ڈنڈا گھمایا تھا کہ انہوں نے ان کے بیٹے جبار کے نام معقول اراضی اور باغات کر دیئے تھے۔ سارے نوکر اس سے لرزتے تھے۔ بوسکی کی قمیض اور ولائتی پتلون چڑھائے ڈٹا پھرتا تھا۔ نام کو ڈرائیور تھا، مگر رعب سب پر جماتا تھا۔ اندر بوبو اور باہر جبار جو نصیبوں کا مارا ان دو پاٹوں کے بیچ آجاتا، ثابت بچ کر نہ جاتا۔

حلیمہ روئے چلی جارہی تھی۔

بجھمن نے ڈانٹا تو ریزہ ریزہ ہوگئی۔ تھک کر چمکارا تو بالکل ہی بہہ گئی۔ اس کے سرد ہاتھ پکڑ کر فرش سے اٹھایا تو ڈٹ کر ان کے سینے لگ گئی۔

اللہ! جاڑوں کی ہوشربا راتیں، طوفان کی گھن گرج اور بجھمن کے ناتجربہ کار ہاتھوں میں بکھری ہوئی حلیمہ!

یار لوگوں نے لونڈیوں کو ٹھکانے لگانے کے کتنے گر بتائے تھے، مگر حماقت کہیے یا پھوٹے نصیب، بجھمن نے ہمیشہ لغو بات کہہ کر سنی ان سنی کردی۔ اپنی کورس کی کتابوں اور کرکٹ کے علاوہ ان کی کسی بھی شے سے گہری شناسائی نہ تھی۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں روئے کی ڈلی حلیمہ نے انہیں جھلس کر رکھ دیا۔ ہاتھ جیسے سریش کی تھالی میں چپک گئے۔

پھر نہ جانے دماغ کے کس کونے میں نشتر سا لگا، اچھل کر دور جا کھڑے ہوئے۔ غصہ سے تھر تھر کانپنے لگے۔

باہر طوفان رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا اور حلیمہ کی سسکیاں تلاطم برپا کئے دے رہی تھیں۔

"حلیمہ مت رو، پلیز! وہ تنگ آکر اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ گئے۔ جی چاہا اس کے سینے پر سر رکھ کر خود بھی دہاڑیں مار مار کر روئیں، مگر ڈر تھا کہ پھر سر وہاں سے اٹھنے کا نام نہ لے گا۔ اپنے کرتے کے دامن سے اس کے آنسو پونچھے۔ اسے اٹھایا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی، باہر دھکیل کر اندر سے کنڈلی چڑھالی۔

نیند تو حلیمہ کے آنسو بہا لے گئی تھی۔ صبح تک بجھمن میاں لحاف میں پڑے

کانپتے رہے۔ اور زہر میں بجھے آنسو بہاتے رہے۔

باہر جھنجھلائی ہوئی ہوا بگڑ کر پیڑوں سے لڑتی رہی۔ کراہتی رہی۔

نایاب بوبو نے سلام پھیرا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے جائے نماز کا کونہ پلٹ کر وہ اٹھیں اور ہولے ہولے سے دروازہ کھول کر جبار کے کمرے میں جھانکا۔ بیٹے کے وجیہہ جسم کو دیکھ کر ممتا سے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

دبے پاؤں وہ اندر آئیں۔ چھمن میاں کے والد نواب فرحت اور جبار کے باپ کی نئی باندی گل تار چوری چھپے روز جبار کے پاس آتی' نشانیاں چھوڑ جاتی تھی۔ آج بھی لحاف میں سے دوپٹہ لٹک رہا تھا۔ انہوں نے دوپٹہ کھینچا۔ یہ نامراد کسی دن ناک چوٹی کٹوائے گی۔ اللہ جبار کو نظر بد سے بچائے۔ ہو بہو باپ کا نقشہ پایا ہے۔

اچانک نایاب بوبو فکر مند ہو گئیں۔ باپ کی لونڈی ماں برابر ہوئی کہ نہیں؟ فتوی لے لیا جائے عالم صاحب سے' تو جی کا ہَول کم ہو۔ یہ کیا کہ دنیا تو گئی' عقبیٰ میں بھی انگارے ہی انگارے۔ نگوڑی گل بہار کا بھی کیا قصور' کہاں وہ بواسیر کے مارے کھوسٹ نواب فرحت اور کہاں یہ کڑیل جوان۔ رات کیا چھکی بھکی روتی تھی۔ کواڑ بھیڑنے کا بھی ہوش نہیں اس لڑکے کو۔ بوبو کی نیند کچی نہ ہو تو نہ جانے کسی کی نظر ہی پڑ جائے۔ اللہ پاک سب کا رکھوالا ہے۔

نایاب بوبو نے جبار کے لئے باقاعدہ باندیاں خریدیں' ایک جاپے میں جاتی رہی' دوسری مہتر کے لونڈے کے ساتھ نکل گئی۔ اس حرافہ نے جی کا چین اڑا دیا تھا۔ شریف گھرانوں کی باندیاں ایسی اچھال چھکا نہیں ہوتیں۔

کئی بار چاہا کہ بیگم سے حلیمہ مانگ لیں۔ مگر ہمت نہ پڑی۔

"نہیں' حلیمہ تو میرے چھمن کے لیے ہے۔" بیگم کو ضد ہے۔ آج ان کی ضد پوری ہوگی ویسے جبار کو مسمی لونڈیاں پسند بھی نہیں۔ باپ کی طرح تنتنیا مرچ چاہیے۔

بڑبڑاتی ہوئی نایاب بوبو باندیوں کے کوٹھے میں پہنچیں تو ان کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

حلیمہ سروری کی رضائی میں دبکی پڑی تھی۔ سلیپر کی نوک سے انہوں نے حلیمہ کے چھاجن میں ٹھوکر ماری اور رضائی کا کونہ پکڑ کر کھینچ لیا۔

حلیمہ گھبرا کر جاگ پڑی اور غافل سوئی ہوئی سروری کے نیچے سے اپنا دوپٹہ کھینچنے لگی۔

بوبو کی چیل جیسی آنکھیں حلیمہ کے جسم پر ٹانکنے بھرنے لگیں۔ حلیمہ چوروں کی طرح سر جھکائے میلی توشک میں لگے ٹانکے گننے لگی۔

"ہوں"! بوبو نے کمر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا:

"میں نے کیا کہا تھا تجھ سے۔"

"جی بوبو۔"

"تو؟"

حلیمہ چپ رہی۔

"اری نیک بخت منہ سے تو کچھ پھوٹ کیا بولے؟"

"ان کے پیروں میں درد نہیں تھا۔" حلیمہ کا سر جھک گیا۔

"ہوں۔ بوبو تسبیح گھماتی ہوئی مڑ گئیں۔ دل میں آپ ہی آپ کلیاں کھلنے لگیں۔ خیر سے بس اب تو نواب فرحت کا نام چلانے والا جبار رہ گیا۔ خدا کی شان ہے بڑے صاحبزادے کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ نگوڑی صنوبر اتنی عمر ہی لے کر آئی تھی۔ مشکل سے چودھواں سال لگا ہوگا۔ کہ صاحبزادے کو پیش کردی گئی۔ کیا پھول سی بچی تھی، ہمیشہ کی دھان پان۔ ماں باپ کا پیار ملتا ایک، نہ ایک دن بابل کا گھر چھوڑ کر شہنائیوں کے سریلے کانوں میں بسائے سسرال سدھار جاتی۔ جہاں دو دل ملتے، ایک گھر بنتا۔ ایک دنیا بستی۔

صنوبر کو بچپن سے ہی دلہن بننے کا ارمان تھا۔ جب دیکھو باندیاں جمع ہیں۔ بڑی بجلی سی بچی تھی۔ چھوٹی ہڈی، کھنچا ہوا بدن، چھوٹے ہاتھ پیر منے منے چھدرے دانت۔ دیوی جیسی روشن انکھڑیاں۔ کتنا کتنا جبار کے لئے چاہا۔ بیگم اڑ گئیں، ان کے ماٹکے کی باندی ہے۔

ماموں جان سے بیٹے کے لئے مانگ کے لائی ہیں۔

یہ کون کہتا ہے۔ صنوبر دلہن نہیں بنی۔ بو بو پشتینی باندی تھیں۔ انہیں خوب احساس تھا کہ ہر عورت دلہن بننا چاہتی ہے۔ باندی ہے تو کیا عورت نہیں، اس کے سینے میں بھی دل ہے ارمان ہیں۔ سر شام ہی سے انہوں نے صنوبر کو نہلا دھلا کر صاف ستھرا پیازی جوڑا پہنایا، اپنے ہاتھوں سے مہندی توڑ کر پسوائی، خوب رچی تھی، بد نصیب کے ہاتھوں پیروں میں، خوشبو دار تیل ڈال کر چوٹی گوندی جس میں ٹول کا موباف ڈالا۔ سیلیاں کانوں میں الٹی سیدھی کھسر پھسر کر کے اسے ستاتی رہیں۔ جب پیروں سے اٹھا کر چھمن میاں کے بڑے بھائی حشمت میاں نے اسے کلیجے سے لگایا تو نگوڑی نے ننھا سا گھونگٹ نکال لیا تھا۔

چودہ برس کی صنوبر جس نے حشمت میاں کا منہ دیکھ کر جانو ملک الموت کا ہی منہ دیکھ لیا سال کے اندر گابھن ہو گئی۔ پھیکی کسیلی مرگھلی سی بچی سارا دن منہ اوندھے پڑی ملبکائیاں لیا کرتی۔ اللہ لوگوں کے کیسے کیسے ناز نخرے ہوتے ہیں۔ میکے سسرال والے صدقے واری جاتے ہیں۔ جب اچھی بھلی تھی۔ نوابزادے سے ہاتھ جڑوا لیتی تھی تب ذرا مسکراتی تھی۔ ایک ایک پیار کے لئے ناک رگڑواتی تھی۔ جب جی سے اتری تو میاں گھن کھانے لگے محل کا دستور تھا جب گائیں بھینسیں گابھن ہو جاتی تھیں انہیں گاؤں بھیج دیا جاتا تھا۔ دو دھاری ہوئی کہ واپس بلا لی گئیں۔ لونڈیاں باندیاں بھی جب بے کار ہو جاتی تھیں تو گاؤں میں ڈلوا دی جاتی تھیں بچہ جن کے وہیں ملنے کو دے آتی تھیں تاکہ محل والوں کو کاؤں کاؤں سے وحشت نہ ہو۔

بڑا فیل مچاتی تھیں نامرادیں، بھینس کی طرح بچھڑے کی یاد میں اراتیں، دودھ بھر کے بخار چڑھتے، تب انہیں کسی بیگم کا بچہ ہلگا دیا جاتا۔ دودھ پلاء کے عیش اڑانے کو ملتے اپنا بچہ بھوکا اسی سے مانوس ہو جاتیں، مگر نواب زادیاں گائے بکریوں کی طرح تھوڑے ان کے لئے بچے جننے بیٹھیں گی۔ زیادہ تر رو پیٹ کر خشک ہو جاتیں اور پھر کام سے لا دی جاتیں ---- مگر صنوبر اڑ گئی کہ گاؤں نہیں جاؤں گی۔

نایاب بوبو نے ہتیرا سمجھایا پر بیگم کے قدم سے لپٹ گئی۔ بوبو دنیا دیکھے ہوئے تھیں۔ لونڈیوں سے انہیں نفرت بھی تھی کہ اپنے وجود سے ہی نفرت تھی۔ مگر ان سے ہمدردی بھی تھی۔

مگر صنوبر کی گھڑی آ گئی تھی' نہ مانی اور حشمت میاں کا منہ کڑوا کرتی رہی کوئی دوسری سمجھاتی تو اس کا منہ نوچ ڈالتی۔

ایک دن نجانے کس بات پر زبان چلانے لگی۔ صاحبزادے کو تاؤ آگیا۔ ایک لات جو کس کے رسید کی تو گری جا کے موری میں۔ بے ڈھب پڑ گئی لات۔ تین دن بھینس کی طرح اراتی رہی۔ کوئی ڈاکٹر بلاتے تو فتنہ کھڑا ہو جاتا۔ پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔ لوگ ویسے ہی دشمن ہیں۔ خیر سے تیسرے دن صنوبر نے غلام گردش کی سب سے تاریک کوٹھڑی میں دم توڑ دیا۔

صنوبر تھی پورم پوڑ جادوگرنی' نجانے کیا کر گئی کہ چار سال حشمت میاں کی شادی کو ہو گئے۔ مگر اولاد کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ کیسے کیسے علاج ہوئے تھے۔ تعویذ گنڈے ہوئے' مزاروں پر منتیں چڑھائیں' مندروں میں دیئے جلائے۔ دلہن بیگم کا پیر بھاری نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ سچ کہ جھوٹ دشمن بیری کہتے ہیں۔ صاحبزادے نے بھری کوکھ لات مار دی تھی۔ اس کارن نامراد ہو گئے۔ جب ہی تو بیگم دلہن کو ہسٹریا کے دورے پڑتے ہیں۔ اور دوڑ دوڑ کے میکے جاتی ہیں۔ وہاں ان کے خلیرے بھائی سنا ہے بڑے عمدہ ڈاکٹر ہیں۔ وہی ان کا علاج کر رہے ہیں اور سنا ہے کچھ اور کھٹ پٹ بھی ہے دونوں میں۔

نایاب بوبو نے ٹھنڈی سانس بھری' بیگم نواب کا منہ ہاتھ دھلانے کے لئے گرم پانی سمویا اور ان کی خواب گاہ کی طرف چل دیں۔

بیگم نواب کو پہلے تو نایاب کے وجود سے کوفت ہوئی تھی' مگر جب وہ قدموں میں بچھ گئی اور یقین دلایا کہ نواب دولہا کی باندی نواب دلہن کی باندی ہے۔ وہ کوئی رنڈی خانگی نہیں۔ نہ نکوں سے خریدی لونڈی ہیں۔ نجانے پشت ہا پشت سے کتنے نوابوں کا خون ان کی رگوں میں موجزن ہے۔ ناچار بیگم کو ماننا پڑا۔ ویسے اب کچھ

اندھیرا بھی نہ تھا۔ خاندان کے سب مرد ادھر ادھر منہ مار لیتے ہیں۔ تاہم نایاب بوبو نے بھی کبھی حد سے آگے پیر نہ نکالے۔ نواب کے میٹھے بول اس کان سنتی اس کان اڑا دیتی جب نواب منور مرزا کے چکر میں پھنسے تو انہوں نے باقاعدہ بیگم کے ساتھ مل کر مورچہ سنبھالا۔ بیگم کی بے دخلی پر خوش ہونے کی بجائے آٹھ آٹھ آنسو روئیں۔ ان کا اور بیگم کا نواب سے اٹوٹ ناطہ تھا، مگر یہ کھسیائی کون ہوتی ہے۔ جاگیر کے کوڑے کرنے والی۔ وہ تو چلتی ہوا کا جھونکا تھا۔ آج اس رخ کل اس رخ۔

انہوں نے بیگم کے ساتھ مل کر محاذ پر بہت حکمت عملی سے کام لیا۔ اور سردار خان کو راکھی باندھ کر بیگم نواب کا بھائی بنا دیا۔ طرحدار خان منور کو ساتھ لے کر پیرس چلا گیا۔ اور جب منور غارت ہوئی۔ تو نایاب نے اپنے ہاتھوں سے سیج سجائی بیگم کو از سر نو دلہن بنایا۔ انہوں نے بیگم کو پھولوں کے گہنے کے ساتھ دو موتی بھی کان میں ڈال دیئے کہ نواب فرحت کو کیسے خوش کرنا ہے۔ اور غلام گردش کی اندھیری کوٹھڑی میں جبار کو کلیجے سے لگائے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

وہ دن اور آج کا دن، نایاب بوبو نے بیگم نواب کی خدمت نہ چھوڑی۔

بوبو کو منہ لٹکائے دیکھ کر بیگم نواب کا ماتھا بھی ٹھنکا۔

خیریت تو ہے۔

رک رک کر بوبو نے تمام تفصیل بتائی۔ بیگم کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ فورا۔ جبار کو موٹر دے کر بھیجا کہ حکیم کو لا دے۔ حکیم صاحب بولے۔ پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ دلہن بیگم، بچہ نا تجربہ کار ہے۔ کمسن ہے، پھر بھی احتیاطا۔ کچھ مقویات مع تفصیل کے غلام صاحبزادے کی خدمت میں بھجوا دے گا۔ اس کے علاوہ سرکار ہو سکتا ہے کہ کسی وجہ سے کراہیت آتی ہو۔ بعض وقت ماحضر کچھ اس ڈھنگ سے پیش کیا جاتا ہے کہ رغبت نہیں ہوتی، اس کا یہ مطلب نہیں کہ معدہ ناکام ہو چکا ہے۔

حکیم صاحب نے عرض کیا۔

"میں پہلے ہی کھٹکی تھی حضور، لونڈیا میں کچھ کھوٹ ہے، نوابزدوں کے مزاج کے لائق نہیں۔ سوکھی ماری مرگھلی، میری مانئے تو سرکار اس نامراد کو باقر نواب کو دے ڈالیئے۔ کئی بار کہہ چکے ہیں ان کے ولائتی کتوں کی جوڑی حشمت میاں کو پسند ہے۔ وہ بخوشی تبدیل کر دیں گے۔ بوبو بیگم کی پنڈلیوں کو دبانے لگیں۔

"اے ہے نوج، میں موئی کو زہر دیدوں گی مگر اس کوڑھی کو نہ دوں گی، موا سڑ رہا ہے سر پر سے" ایسا اندھیر تو خاندان میں کبھی نہیں ہوا کہ لونڈی جائے اور صحیح سلامت لوٹ آئے۔

تکلفات خیال کئے بغیر ہی پیش دستی کر بیٹھتے ہیں۔ کہیں بھائی بھائی میں رقابت نہ ٹھن جائے۔ اس لئے گھر کی بیگمیں احتیاط سے بٹوارہ کر دیتی ہیں۔ پھر مجال ہے جو دوسرے کی باندی پر کوئی ڈانت لگائے۔ بالکل قانونی حیثیت ہوتی ہے اس گھریلو فیصلے کی۔

"میں تو عاجز ہوں اس لڑکے سے، اٹھارہ انیس کا ہونے کو آیا۔ کیا مجال جو کسی لونڈی باندی کو چھیڑا ہو کہ چٹکی بھری ہو۔ ہمارے بھائی تو ادھر دس بارہ کے ہوئے اور خرمستیاں شروع کر دیں سولہ سترہ کے ہوئے اور پھیل پڑے۔ اے نایاب نگوڑی ڈھنگ سے نہائی دھوئی بھی تھی کہ تم نے ہلدی لسن میں سڑتی ہوئی میرے بچے کی جان پر تھوپ دی۔ بیگم نواب بولیں۔

"اے حضور مجھے اناڑی سمجھا ہے؟ اللہ کی عنایت سے ان ہاتھوں نے ایسی کیسی باندیاں سنواری لونڈیا کی ایڑی دیکھ کر سرد ذات کوہ قاف کی پری کو نہ پوچھے۔ حشمت میاں فرنگن سے پھنسنے کو ہو رہے تھے۔ مگری میرے ہاتھ کی صنوبر سو رات ہوئی کہ نہیں؟" بوبو اپنے فن پر آنچ آتے دیکھ کر بڑی چراغ پا ہوئیں۔

اے قربان جاؤں بیگم، آپ کا لال جوانوں کا جوان ہے۔ دن بھی تو اب خراب ہیں۔ پچھلے دنوں بھاری قیمت دے کر دو باندیاں افضل نواب نے خریدیں، پولیس نے ناطقہ بند کر دیا۔ بہت کچھ کھلایا پلایا، بہت کہا کہ اللہ نام پر غریب لڑکیوں کی پرورش کر رہے ہیں۔ مگر لڑکیاں کسی ہوم سوم میں اللہ ماری پہنچا دی گئیں۔

ڈیڑھ ہزار پر پانی پھر گیا۔ اب نئی باندی ملنا بھی تو مشکل ہے۔

اگر تیسری جنگ شروع ہوتی تو بھی محل میں ایسا طوفان نہ مچتا۔ بات رینگتی ہوئی سارے خاندان میں پہنچ گئی۔ جانو ہر چہار طرف سنپولئے چھوٹ گئے۔ ایک سے دوسرے منہ تک جانے میں کتنی دیر لگتی ہے، جس نے سنا، چھاتی کوٹ لی۔

"ہے ہے اچھن میاں۔"

افضل میاں کو پتہ چلا، پائنچہ پھڑکاتے، پیک کا غرارہ منہ میں سنبھالے آن پہنچے اور سیدھے بجھمن کی جان پر ٹوٹ پڑے۔

"اوی ماں ہمیں کیا معلوم تھا۔ یہ قصہ ہے، ورنہ تمہاری بھابی کا پھندا کاہے کو گلے میں ڈالتے۔ جان من اب بھی کچھ نہیں گیا ہے، بندہ حاضر ہے۔" کسی زمانے میں وہ بجھمن پر بری طرح لٹو ہو گئے تھے بڑے سرکار نے گولی مار دینے کا الٹی میٹم دیا، تب ہوش میں آئے۔ بجھمن ان سے بے طرح چڑتے تھے۔

بکواس مت کیجئے۔ ایسی کوئی بات نہیں، اصل میں مجھے یہ باتیں پسند نہیں، میرا مطلب ہے بغیر نکاح ناجائز ہے۔"

"بالکل جائز نہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے جد امجد سب کے سب حرامکار تھے۔ ایک آپ پیدا ہوئے ہیں۔ متقی پرہیز گار۔"

"میرا خیال ہے کہ-----"

"آپ کا خیال سالا کچھ نہیں، کبھی ارکان دین کا مطالعہ فرمایا ہے؟"

"نہیں تو، مگر----- یہ بات عقل میں نہیں۔"

پتھر پڑ گئے ہیں آپ کی عقل مبارک پر معلوم ہے نہیں کچھ اور آئیں بائیں شائیں ہانکنے لگے۔"

"مگر قانونا، جرم ہے"۔

"ہم یہ کافروں کے قانون کو نہیں مانتے ہم خدائے ذوالجلال و الکرام کے حکم پر سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں لونڈی غلام کے ساتھ اولاد جیسا سلوک کیا

جاتا ہے۔ نایاب کو دیکھو، ملکہ بنی راج کر رہی ہے۔ ان کے بیٹے کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، سب ہی باندیوں پر چربی چڑھ رہی ہے۔ ہاں تمہیں سوکھا مارا مال دیا گیا ہے، تو میاں سروری لے لو۔ دنبہ ہو رہی ہے۔"

"ہشت"

"ہم کہتے ہیں آخر معاملہ کیا ہے؟"

"کچھ معاملہ نہیں، آپ مہربانی فرما کر میرا بھیجا نہ چاٹیے۔"

"تمہاری مرضی، تم کو جگ ہنسائی کا شوق ہے تو کون روک سکتا ہے، تمہاری مرضی اور سرکار شاید آپ کو پتہ نہیں کہ آپ کی منگیتر۔"

"میری کوئی منگیتر ویگیتر نہیں۔"

"ابھی نہ سہی، ہو تو جائیں گی۔ وہ حرمہ خانم اس لقندرے سے بہت میل جول بڑھا رہی ہیں۔ منصور سے۔"

"تو میں کیا کروں۔"

"بتاؤں کیا کرو، ابھی صدر کی طرف کو جا رہا ہوں منہارن کو بھیجے دیتا ہوں، بھر کلائیاں چوڑیاں پہن لو اور کیا۔" انہوں نے پیک بھرا قہقہہ مارا۔

جہالت، سب جہالت کی باتیں ہیں۔"

"ہمارے قبلہ و کعبہ جاہل تھے؟"

"ہوں گے مجھے کیا پتہ۔"

"ابے کیوں گھاس کھا گئے ہو، بزرگوں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی رواج بنایا، اب تک ہمارے خاندانوں میں اسی پر عمل ہوتا چلا آیا ہے۔ باندی مل جائے تو جوان لڑکے بے راہ نہیں ہوتے بری لتوں سے بچتے ہیں، صحت اچھی رہتی ہے۔"

"یہ سب حرام کاری کو جائز بنانے کے ہتھکنڈے ہیں۔"

"تم کفر بک رہے ہو، مذہب کی توہین-----"

"ارے جائیے بڑے مذہب والے آئے، مذہب کی بس ایک ہی بات دل پر نقش ہے۔"

نالائق بھی ہو اور---- بدتمیز بھی۔ لاحول ولا' میری بلا! سے تم جہنم میں جاؤ۔"

رات کو خاصا چنا گیا تو نایاب بوبو نے بڑے اہتمام سے چاندی کی چمچی میں معجون مرکب جواہر والا چاندی کے ورق میں لپیٹ کر پیش کیا۔ حکیم صاحب کی ہدایات کا پرچہ چھمن سے بے پڑھے پھاڑ دیا تھا اور سروری کو ڈپٹ بتائی تھی۔ چھمن کا جی پاپا کی قاب میں ڈوب مریں۔ انہوں نے معجون کو ہاتھ مار کر گرا دیا۔ اور پیر پٹختے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ساری دنیا ان کو نامرد سمجھ رہی تھی۔

انہوں نے اب تک جتنی علمی اور ادبی کتابیں پڑھی تھیں' سب ہی میں بغیر شادی کئے کسی عورت سے تعلقات رکھنے والے کو زانی اور بدکار کہا گیا تھا۔

باہر پھر آج ہوا بپھری ہوئی ڈائن کی طرح ہونک رہی تھی' کھڑکی کے شیشے پر ایک کمزور سی ٹہنی بار بار پٹخ رہی تھی' جیسے ہوا سے بچ کر اندر چھپنے کے لئے دستک دے رہی ہو۔ بڑی مشکل سے آنکھ لگی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بوندیں ان کے پیروں پر رینگیں تو گھبرا کر جاگ پڑے۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔

حلیمہ ان کے پیروں پر منہ رکھے سسک رہی تھی۔ جلدی سے انہوں نے پیر کھینچ لئے پھر وہی آنسوؤں کا طوفان' یہ لڑکی تو دشمن سے مل کر ان کے خلاف مورچہ بندی پر تلی ہوئی تھی۔ یہ لوگ انہیں ڈبو کر ہی دم لیں گے۔

"کیا ہے؟ انہوں نے ڈپٹا۔

"کیا میں اتنی گھناؤنی ہوں کہ سرکار کے پیر بھی نہیں چھو سکتی۔" حلیمہ کراہی۔

"بھئی یہ کیا گدھا پن ہے۔ جاؤ ہمارے کمرے سے۔"

"نہیں جاؤں گی' کیا سمجھا ہے مجھے' باندھی ہوں' کوڑھن تو نہیں۔ سارا محل میرے جنم میں تھوک رہا ہے' میرا مذاق اڑایا جارہا ہے کہ آپ کو مجھ سے گھن آتی ہے۔ میں آپ کے لائق نہیں۔ کل سے سروری آپ کی خدمت گزاری پر مقرر کی

جائے گی۔"

"ہم اس سور کو بہت ماریں گے۔ ہمیں خدمت گزاری کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"ہو جائے گی، ضرورت، حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ ----!"

"جھک مارتے ہیں حکیم صاحب الو کے پٹھے۔"

"تو میں کیا کروں۔"

جاؤ، سو جاؤ بہت رات ہو گئی۔"

"میرے لئے کیسا دن اور کیسی رات، پر اتنا تو احسان کیجئے کہ مجھے زہر ہی لا دیجئے۔"

"ہم کیوں لا دیں زہر؟ بیوقوف، کیسی باتیں کر رہی ہے۔ خود کشی گناہ ہے۔"

"تو پھر باقر نواب کی آگ میں جا کر جلوں، انہیں گرمی کی بیماری ہے۔ چھوٹے میاں۔" حلیمہ پھر دریا بہانے لگی۔

"نواب باقر، ان کمبخت کا ذکر کیا ہے۔"

"انہی کا تو ذکر ہے، آپ سروری کو قبول کر لیجئے، مجھے ان کے ہاتھ بیچا جا رہا ہے ----- ولائتی کتوں کی جوڑی کے عوض جو اٹھارہ سو کی تھی۔"

"افوہ کیا بکواس ہے۔"

"باقر نواب اندر سے سڑ رہے تھے، مہترانی بوبو سے کہہ رہی تھی۔ بوبو کو تو مجھ سے بیر ہے۔ میں نے جبار کے منہ پر جوتی مار دی تھی۔"

ٹھنڈے دل سے حلیمہ نے سمجھایا تو غصہ سے کانپنے لگے۔ ان کا جی چاہا حلیمہ کے آنسو اپنے دامن میں سمیٹ لیں، مگر اسے ہاتھ لگاتے جی کانپ رہا تھا کہ ہاتھ لگا تو چھوٹنا مشکل ہو جائے گا۔

"کیا تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو؟" چھمن میاں نے پوچھا۔

میرے اللہ ساری دنیا کو معلوم ہے، حربہ بیٹا بچپن کی مانگ ہے، آپ کی۔"

"اور تم؟"

"میں تو آپ کی باندی ہوں۔"

"تم ہماری باندی ہو۔ تمہاری باندی ماں تو باندی نہیں تھی۔ نہ تمارا باپ باندی زادہ تھا۔ تم تو سیدانی ہو حلیمہ۔ تمہارے ابا کسان تھے۔'

حلیمہ ---- سنو حلیمہ ------ اس نے اس کے دونوں ہاتھ مٹھی میں پکڑ لئے۔ سنو تو ہم پیاری امی سے آج ہی کہیں گے کہ ہم حرمہ سے شادی نہیں کریں گے۔ ہماری شادی تم سے ہوگی۔"

"شادی! حلیمہ نے جھٹکے سے دونوں ہاتھ چھڑا لئے "توبہ توبہ آپ تو واقعی بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ یاد ہے الف کا انجام' صادق نواب نکاح کر رہے تھے' زہر دلوا دیا بڑی بیگم صاحبت نے' ہائے کیسی تڑپی ہے تین چار دن' دم ہی نہ نکلتا تھا موئی کا چھوٹے میاں' ایسا ہی ہے تو اپنے ہی ہاتھوں سے گلا گھونٹ دیجئے۔" حلیمہ نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے گلے پر رکھ لئے۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا' حلیمہ کا جسم گوند کا بنا ہوا تھا۔ بھمن کے ہاتھ الجھ گئے۔

"جاؤ ---- جاؤ حلیمہ ---- پیاری حلیمہ ---- جا ---- جا ----"
انہوں نے سمیٹ لیا۔

"اف کتنے ٹھنڈے ہیں تیرے ہاتھ ---- حلیمہ ----"

"تو گرم کر دیجئے میرے سرکار!" اس نے بھمن میاں کے کرتے کے بٹن کھول کر اپنے چھوٹے چھوٹے سرد ہاتھ ان کے بےقرار اچھلتے ہوئے دل پر رکھ دیئے۔ روتے سسکتے دو معصوم ناتجربہ کار بچے ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئے۔ باہر ہوا دبے پیر شرمائی ہوئی نئی دلہن کی طرح آہستہ آہستہ جھوم رہی تھی۔

بھمن میاں کی تو ہر بات بے تکی اور نرالی ہوا کرتی تھی۔
سب ہی ان پر ہنستے تھے۔ کھلونوں سے کھیلتے ہیں' ان کی پوجا نہیں کرنے لگتے۔ بیگم نے اس صبح کیا اطمینان کی سانس لی تھی۔ جب بو بو نے انہیں جھک کر

سلام کیا- اور جی کھول کر مبارک باد دی تھی- آٹھ بجے تھے اور ماشاء اللہ ابھی تک دروازہ بند تھا-

پھر جب صاحبزادے کالج چلے گئے تو بیگم نے اپنی آنکھوں سے ثبوت دیکھ کر دو رکعت نفل شکرانے کے پڑھے- حلیمہ کو حرارت ہو گئی تھی- اپنی کوٹھڑی میں منہ اوندھائے پڑی تھی- بوبو آتے جاتے گندے مذاق کر رہی تھی- سارے محل میں غلغلہ تھا کہ چھوٹے میاں نے حلیمہ کو قبول کر لیا- دوسری باندیاں جلتی پھر رہی تھیں- حلیمہ قسمت والی تھی کہ ایسا بجل معصوم دولہا ملا- اپنی بات چیت میں باندیاں دولہا کہہ کر ہی دل کو سہارا دے دیا کرتی تھیں-

لڑکیوں کو دیکھ کر بجمن میاں کے ہمیشہ ہاتھ پاؤں پھول جایا کرتے تھے، مگر حلیمہ کو ایک بار چھو کر وہ کسی کام کے نہ رہے- خالی گھنٹہ ملا اور بھاگے چلے آ رہے ہیں- یار دوست چھٹی اتوار کے دن آتے ہیں، میاں بہانہ بنا رہے ہیں، مجھے پڑھنا ہے اور پڑھتے بھی تو حلیمہ کے زانوں پر سر رکھا ہوا ہے ہر فل سٹاپ پر پیار کا نکتہ-

"گنوار لٹھ، کاش ذرا پڑھ لیا ہوتا تو میرے نوٹ فیئر کر دیتی-" اور حلیمہ بیٹھی کوئلے سے زمین پر اے- بی- سی- ڈی کاڑھ رہی ہیں-

"میرے فونٹین پین میں سیاہی تو بھر دو یار-"

سیاہی میں دونوں ہاتھ، ناک، منہ، اوڑھنی رنگ گئی اور اوپر سے ٹسوے بالکل گدی ہے- بڑا اعلیٰ انتظام ہوا کرتا تھا، میاں کو ایک حصہ الگ محل کا دے دیا جاتا تھا- باندی سے پھر کسی اور کام کی توقع نہیں کی جاتی تھی- حلیمہ تو نایاب بوبو کی سدھائی تھی- بیگم کا ہاتھ منہ دھلانے پر ضد کرتی- پاندان پونچھنے سنوارنے، تازہ کتھا چونے بھرنے اور چھوٹے موٹے کام سے منہ نہ موڑتی-

"اے بھئی بس اپنے چھوٹے سرکار کو سنبھالو-" بیگم اسے ٹالتیں، مگر وہ سر ڈھکے گردن جھکائے ضد سے ان کے پیر دباتی- ساس ہی تو ہوئیں- ان کا پوت بھی تو لونڈی کے پیر چومتا ہے-

نئے جوڑے زیور سب ہی کچھ دیا جاتا تھا- بالکل علیحدہ گھرداری کا سا لطف

آجاتا تھا۔ جی چاہا تو اپنی طرف کے باورچی خانہ میں کوئی تازہ چیز جھٹ پٹ بگھار لی۔ روز مالن بھر ٹوکری پھول گجرے دے جاتی۔ مگر سیج پر پھول چمن میاں کو کبھی نہ بھائے۔

"بھئی بڑا دکھ ہوتا ہے، پھولوں پر چڑھے لیٹے ہیں۔ بڑی بے رحمی ہے۔" وہ سارے پھول سمیٹ کر حلیمہ کی گود میں بھر دیئے۔

نایاب بوبو وہی اپنے طوطے جیسی رٹ لگائے ہوئے تھیں کہ ادھر متلیاں لگیں، ادھر موئی مردار ہوئی۔ لوگ بیاہتا تک کو جی سے اتار دیتے ہیں تو باندی کی بھلی چلائی۔ جھمن کا جنون اور لگن دیکھ کر بوبو سرور سے آنکھیں نیم باز کر لیتیں۔

سوچتی ہوں کہ اب کے خالی چاند میں نکاح ہو جائے مجھے کچھ فیروزہ خانم اکھڑی اکھڑی لگیں۔"

بیگم نواب اب جھمن میاں کی مردانگی سے مطمئن ہو کر بولیں۔

کہنے والوں کے منہ میں خاک، سنتے ہیں حرمہ بیٹیا بی آزاد ہو گئی ہیں۔ بوبو نے اطلاع دی۔

بیگم کہنے والوں----- کے منہ میں انگارے کہ کوئی ارشد میاں کا یار ہے۔ بہت آنا جانا ہے اس گھر میں۔"

"ہے ہے، تم سے کس نے کہا؟"

طرحدار کی دلہن بہت آتی جاتی رہتی ہیں، ان کی ممانی لگتی ہیں جو سوزن کاری سکھانے جاتی ہیں مریم بیٹا کو کہہ رہی تھیں خوب گیند بلا ہووے ہے۔ اللہ رکھے اپنے میاں کی پڑھائی میں کون سے روڑے اٹکتے ہیں۔ میری مانئے تو جھمن میاں کا حرمہ سے نکاح ہو جائے تو اچھا ہے۔

مگر لڑکا تو پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتا۔ کہتا ہے کہ حلیمہ سے ہی نکاح پڑھوا دو۔ میں نے کہا ہے اب تو کہا ہے، پھر اگر یہ خرافات منہ سے نکالی تو قسم سے جان دے دوں گی۔"

اے بیگم بکتے ہیں، ان نوابوں کے قول و فعل میں کون سی سنگت تیل دیکھئے

تیل کی دھار دیکھئے۔ اسی اٹھوارے میں سیدھے کھکا ہو جائیں گے۔ لونڈیا مجھے کچھ مری مری سی لگتی ہے۔"

بوبو سے محل کا کوئی راز پوشیدہ نہ تھا۔ گائے بھینس حتیٰ کہ شاید چوہوں تک کا پیر بھاری ہوا کہ بوبو نے تاڑ لیا۔ وہ تو مرغیوں کے منہ لال دیکھ کر سمجھ جاتی تھیں کہ کڑکی اتر گئی اور انڈا دینے والی ہے۔

"پیاری امی کیا حلیمہ گاؤں جا رہی ہے؟" بھمن نے آخر دوبڈو پوچھ ہی لیا۔ حلیمہ کئی روز سے ٹسر ٹسر رو رہی تھی۔

ہاں چندا' نایاب بوبو بھی ساتھ جائیں گی۔ امی حضور سے میں نے کہلوا دیا ہے کہ تمہارے لئے نیبو کا اچار ضرور ارسال فرمائیں۔"

"مگر پیاری امی" بھمن بولے:

"حلیمہ کو کیوں بھیج رہی ہیں۔ میرے کپڑے کی دیکھ بھال کون کرے گا۔"

"سروری ہے' لطیفہ ہے۔" "سروری' لطیفہ نے میری کسی چیز کو ہاتھ بھی لگایا تو---- مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ ہاں' مگر حلیمہ کو کیوں بھیج رہی ہیں۔" بھمن منمنائے۔

"ہماری مرضی۔ تم ان معاملوں میں کون ہوتے ہو دخل دینے والے۔"

"مگر پیاری امی۔"

"میاں ابھی تو ہم جیتے ہیں۔ قبر میں تھوپ آؤ۔ تب من مانی کرنا۔" پیاری امی کی آنکھوں میں سے چنگاریں چٹخنے لگیں۔ اندرون خانہ کے معاملہ میں تمہیں کیا تمہارے باوا تک کو دخل نہیں' تمہیں آج تک تکلیف ہوئی ہے جو اب ہو گی۔ باندیوں کے معاملے میں بوبو کا فیصلہ ہی چلتا ہے۔"

"پیاری امی' حلیمہ باندی نہیں میری جان ہے۔ سید زادی ہے۔ آپ نے خود بڑے شوق سے انتخاب فرما کر اسے میرے دل میں بھیجا ہے اور کچے ناخنوں کو گوشت سے جدا کر رہی ہیں' کیوں! کون سی چوک ہوئی مجھ سے۔" انہوں نے کہنا چاہا مگر جذبات نے گلا پکڑ لیا۔ حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ اور وہ سر جھکائے اٹھ

گئے۔

حلیمہ اپنے آنسوؤں سے خائف تھی۔ یہ آخری چند دن وہ دھوم دھام سے گزارنا چاہتی تھی۔ پھر زندگی وفا کرے نہ کرے۔ ابھی چار دن باقی تھے زندگی کے، ان چار سلونے دنوں کے لئے اس نے چار جوڑے نک سک سے تیار کئے تھے۔ عطر کی بو سے تے آرہی تھی، نگرجی پر پتھر رکھ کر اس نے بستر کی ہر تہہ کو بسا دیا تھا۔ بال دھو کر مصالحہ کی خوشبو بسالی تھی۔ ہاتھ پیر کی پھیکی مہندی کو اجاگر کرلیا اور بھر بھر ہاتھ چوڑیاں چڑھالی تھیں۔ کیونکہ بنجمن میاں کو چٹ چٹ چوڑیاں توڑنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ کتنی بھی توڑ ڈالیں۔ سہاگ کے نام کی دو چار بچ ہی جائیں گی۔

"گاؤں جانے کا غم نہیں۔" بنجمن نے اسے پھول کی طرح کھلے دیکھ کر پوچھا۔ خود ان کا دل لہو ہو رہا تھا۔ و

"نہیں"۔ بوبو نے نسوے بہانے کو منع کر دیا تھا۔

"کیوں؟" انہیں تاؤ آگیا۔

"جلد ہی تو آجاؤں گی۔"

"کتنی جلدی۔"

تھوڑے دنوں بعد۔"

"کتنے ہوتے ہیں تھوڑے دن۔"

"بس چھ سات مہینے۔"

"چھ مہینے۔"

"آہستہ بولئے۔"

"ہم مرجائیں گے حلیمہ۔"

"اللہ نہ کرے، آپ کی بلائیں میرے سر میرے نوشاہ۔ بُرے فال منہ سے نہ نکالئے۔ اللہ اپنے رحم و کرم سے مجھے آپ کی خدمت کے لئے ضرور واپس لائے گا۔ سب ہی تو نہیں مرجاتیں۔ صنوبر کی اور بات تھی۔ بڑے سرکار نے لات مار دی تھی تو پیٹ میں بچہ مرگیا۔ ہائے میں مرجاؤں۔ سہم کر اس نے منہ پر ہاتھ رکھ

لیا- یہ وہ کیا بک رہی تھی-

"بچہ!" بجمن تڑپ کر اٹھ بیٹھے-

"نہیں، نہیں چھوٹے میاں------ میں-"

"میرے سر کی قسم کھا-" بجمن میاں نے اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا-

"نہیں اللہ نہیں-"

"چھوٹی، حلیمہ-" انہوں نے جلدی سے لیمپ جلایا- سہمی ہوئی نظروں سے تکنے لگے- پھر مجرموں کی طرح سر جھکا لیا- گود میں ہاتھ رکھے بیٹھے رہے-

بچہ' ان کا بچہ زندہ انسان کا بچہ-" جی چاہا نہ جانے کیا کریں- زور سے ایک قلانچ بھریں- یہ آسمان پر جو تارے جگمگا رہے ہیں' سارے کے سارے توڑ کر حلیمہ کی گود میں بھر دیں-

"کب ہو گا؟" انہوں نے پوچھا-

"شاید چھ مہینے بعد-" حلیمہ شرما گئی-

"اوہ تب تک تو میرا رزلٹ بھی نکل آئے گا-" وہ ٹالنے لگے-

حلیمہ کا دل جھونکے کھانے لگا- گاؤں سے اس بدنصیب کے رونے کی آواز کیسے پہنچے گی- سرکار کے کانوں میں' بے حیا اور ماں کی طرح سخت جان ہوا تو شاید دوسری لونڈی بچوں کے جھرمٹ میں پل جائے گا- باپ اسے پہچانے گا بھی نہیں' بیٹا نہیں غلام ہو گا' کپڑوں پر استری کرے گا- جوتے پالش کرے گا- اور اگر بیٹی ہوئی تو کسی کے پیر دبانے کی عزت حاصل کر کے گاؤں میں زندگی کا تاوان ادا کرنے چلی جائے گی-

مگر حلیمہ کی زبان کو تالا لگا ہوا تھا- بوبو نے کہہ دیا تھا-" مالزادی اگر صاحبزادے کو بھڑکانے کی کوشش کی تو بوٹیاں کر کے کتوں کو کھلا دوں گی-"

"حلیمہ تم گاؤں نہیں جاؤ گی-"

"ایسی باتیں نہ کیجئے-"

"میں تمہیں نہیں جانے دوں گا-"

"لللہ میرے بھولے سرکار۔"
مگر انہوں نے اسے بولنے نہ دیا۔ بوبو کہتی تھیں پیٹ والی عورت سے مرد ذات کو گھن آتی ہے۔ تو یہ کیسا مرد تھا کہ بالکل وہی پہلے دن کا سا پیار۔
دوسرے دن چھمن میاں نے کالج کو لات ماری اور اپنی اکیلی ہستی کا وفد لے کر ہر دروازے پر دہائی دے ڈالی۔
"بھائی جان، حلیمہ کو گاؤں کیوں بھیج رہے ہیں۔"
"میاں، محل کا پرانا دستور ہے۔"
"وہ گائے بھینس نہیں، میرے بچے کی امانت دار ہے۔"
صاحبزادے کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "بھئی حد کرتے ہو تم بھی۔ یہ باتیں ہمارے سامنے کہتے ہوئے تمہیں شرم بھی نہیں آتی۔ لاحول ولا قوہ۔" وہ بھنا کر اٹھ گئے۔
محل کی پالیٹکس میں مردوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ پیاری مائیں جب مناسب سمجھتی ہیں، چاق و چوبند باندی پیر دبانے کو مہیا کر دیتی ہیں۔ جب اسے صحت کے لئے مضر اور بیکار سمجھتی ہیں۔ دوسرے کاٹھ کباڑ کی طرح مرمت کے لئے بھجوا دیتی ہیں۔ عوض پر دوسری آجاتی ہے۔ باندی سے جسم کا رشتہ ہوتا ہے۔ شریف آدمی دل کا رشتہ نہیں کر بیٹھتے۔
"افضال بھائی پیاری امی سے کہئے حلیمہ کو گاؤں نہ بھیجیں۔" انہوں نے اپنے چچا زاد بھائی کی خوشامد کی۔
"للاں دیوانے ہوئے ہو۔ پیٹ والی عورت کے لئے مضر ہوتی ہے۔ کیوں اتنا سٹپٹاتے ہو۔ دوسرا انتظام ہو جائے گا۔" انہوں نے ہنس کے ٹال دیا۔
"مجھے دوسرا انتظام نہیں ہونا چاہیئے۔"
"اور پھر دسمبر میں تمہارا نکاح ہے حرمہ بی بی سے۔"
"میں حرمہ سے شادی نہیں کروں گا۔"
"حلیمہ گاؤں جائے گی تو میں کالج چھوڑ دوں گا۔" انہوں نے اعلان کر دیا۔
"اچھا جی صاحبزادہ کی یہ مجال۔" بیگم کا خون کھول گیا۔ "اسے ضد کرنا آتی

ہے تو ہمیں بھی جواب دینا آتا ہے۔ اب تو چاہے میری میت اٹھ جائے' نامراد حلیمہ یہاں ایک گھڑی نہیں رہ سکتی۔ پرسوں ورسوں نہیں' نایاب تم اسی وقت تیار کرو۔ قسم جناب کی۔"

"نجم بیٹا بھی اللہ رکھے امید سے ہے۔ فراغت پاکر ولایت جانے کا ارادہ ہے۔"

"اس کا کیا ذکر ہے' خدا جیتا رکھے میری بیٹی کو۔" انجم بجھمن میاں کی بہن کا نام تھا۔

"آمین' مگر گود والے کو ولایت سنگ تو نہ لے جائیں گے۔ اور وہ دولہا نواب کا اکیلا جانا بھی درست نہیں' وہ نگوڑی فرنگن پھر پیچھے لگ گئی۔ تو قیامت ہی آجائے گی۔"

"اے ہے نایاب کہنا کیا چاہتی ہو۔'

"نجم بیٹا بھی زحمت سے بچ جائیں گی۔ وہ لندن جائیں گی تو بعد میں حلیمہ ان کے بچے کو دودھ پلا سکے گی۔ اچھا پاک دودھ بھی بچے کو ملے گا۔"

"جو حکم سرکار۔"

"مگر گاؤں میں اچھی دیکھ بھال نہ ہو تو------ حلیمہ دھان پان تو ہے ہی' یہاں نظروں کے سامنے رہے گی۔ میرے ہاتھ کے نیچے' موئی کو اچھی طرح ٹھساؤں گی اور پھر صاحبزادے کی ضد بھی پوری ہو جائے گی۔"

"ضد ہی تو نہیں پوری------ کروں گی بس۔" مگر بیگم ذرا نرم پڑ گئیں۔ آپ کی مرضی' پر اتنا عرض کروں گی' بس کچھ دن جاتے ہیں کہ میاں کا جی بھر جائے گا۔ اپنا کام نکلے گا۔ ان پر احسان الگ سے ہو گا۔"

نایاب کے پیٹ میں جب جبار نے نزول فرمایا تو فرحت نواب ٹھنڈے پڑ گئے۔ جب عورت حاملہ ہو جاتی ہے تو مرد کی دل چسپی ختم ہو جاتی ہے کہ یہ قانون قدرت ہے۔

مگر بجھمن میاں قانون قدرت اور نایاب بوبو کو جھٹلا رہے تھے' کیونکہ وہ

دیوانے تھے کہ پیر کی جوتی کو کلیجہ سے لگا رکھا تھا۔ ایسی بے حیائی تو کسی نوابزادے نے کسی بیگم کے معاملے میں نہیں لادی۔ سر جھکائے مارا مار زچہ بچہ کے رکھ رکھاؤ پر کتابیں پڑھی جا رہی ہیں۔ سارا جیب خرچ باندی کے لئے وٹامن کی گولیاں اور ٹانک لانے پر خرچ ہو رہا ہے۔

حلیمہ صحن میں بیٹھی بجھمن میاں کے کرتے پر مری کا کام کر رہی تھی۔ کچ سے سوئی انگلی میں اتر گئی۔ وہ جانتی تھی' وہ گاؤں کیوں نہیں بھیجی گئی تھی مگر اس نے بجھمن کے خواب چکنا چور نہ کئے تھے۔

بجھمن میاں کو ہول سوار ہو رہے تھے۔ انہوں نے اتنے قریب سے حاملہ عورت کبھی نہ دیکھی تھی۔ سنا تھا نجم باجی کے کچھ ہونے والا ہے' مگر وہ تو بس اوڑھے لپیٹے دھمابی کراہا کرتی تھیں۔ گھڑی بھر کو سلام کیا' دور بھاگ لئے۔

انہیں ڈر لگتا تھا کہ حلیمہ کہیں مینڈکی کی طرح پھٹ نہ جائے۔ کتابوں سے بھی تسلی نہ ہوئی تو فرخندہ نواب کے ہاں بھاگے گئے۔

فرخندہ نواب سے سب خاندان والے فرنٹ تھے' کیونکہ کسی زمانے میں وہ اوٹ پٹانگ محبت کر کے ہاتھ جلا چکی تھیں' مگر اشرف صاحب ان کے میاں پولیس میں تھے' اس لئے سب کو غرض پڑتی تھی اور ان کی چاپلوسی کرنا پڑتی تھی۔

ویسے بھی بیگمیں ان سے بہت کٹتی تھیں کہ وہ بہت عالم فاضل تھیں۔ ان کے بیٹے نعیم سے بجھمن کی بہت گھٹتی تھی۔

بجھمن میاں کے پرکھوں کو بھی پتہ نہ تھا کہ پیاری امی نے ان کی دلہن کے زیورات کے بارے میں صلاح لینے کے لئے جمعہ کے روز بلایا ہے۔ فرخندہ زیر لب مسکرائیں اور وعدہ کیا کہ جمعہ کے روز آئیں گی تو ان کی حلیمہ کو بھی دیکھ لیں گی۔

پورٹیسکو سے اتر کر پہلے وہ بجھمن کی طرف چلی گئیں۔

فرخندہ نواب نے ان کی بوکھلاہٹ پر سرزنش کی۔ "حلیمہ بالکل ٹھیک ہے۔ پھٹے وٹے گی نہیں۔

اتنا چربی والا کھانا نہ کھلاؤ' پھل اور دودھ دو۔"

"تسلیم پھوپھی جان۔" حلیمہ نے چلتے وقت ذرا سا گھونگھٹ ماتھے پر کھینچ لیا۔

"جیتی رہو میری گڑیا"۔ فرخندہ جلدی سے گڑیا کے گھروندے سے نکل گئیں۔

ادھر بیگم نواب کے کمرے میں انہوں نے بجمن کی دلہن کے زیورات دیکھے تو گم سم بیٹھی رہیں۔

"اے بے کچھ رائے دو کہ منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھی ہو۔"

"بھابی جان زمانہ بدل رہا ہے۔ حرمہ بڑی پیاری بچی ہے، مگر وہ------"

"ہاں ہاں کہو، وہ بڑی فیشن ایبل ہے، زیور گنوارُو ہے تو میں بمبئی سے منگوا رہی ہوں۔"

اچھا ہے کھل کر بات ہو جائے------ فرخندہ بیگم کچھ اکھڑی اکھڑی بیٹھیں۔ پھر بہانے بنانے لگیں کلب کی میٹنگ ہے۔ ان کے جانے کے بعد بوبو اور بیگم ان میں کیڑے ڈالتی رہیں۔

نایاب زیور دکھانے کو گئیں تو پتہ چلا فیروزہ نواب تو اپنی کسی ملنے والی کے ہاں گئی ہیں۔ حرمہ گیند بلا کھیل رہی تھیں۔

حرمہ دھم دھم کرتی آئیں۔ نایاب بوبو نے زیورات کا صندوقچہ دکھایا اور بولیں۔

زیورات، رانی بیٹا پسند فرما لیجئے۔"

"اوہ، مگر حلیمہ بی بی کے لئے میری پسند کے زیوروں کی کیا ضرورت ہے۔"

حرمہ لاپرواہی سے مڑ کر کٹے بالوں میں برش گھسیٹنے لگی۔

"اے خدا نہ کرے، حلیمہ باندی ہے۔"

"اچھا وہ بچہ بجمن میاں کا ہے نا۔"

"بچہ!" بوبو کو پسینے چھوٹنے لگے۔ "کیسا بچہ؟"

"فرخندہ خالہ کہہ رہی تھیں کہ------"

اے نہیں بیٹا------ وہ------ توبہ ہے بچی جھاڑ کا کانٹا ہو گئی۔ اماں

جان نہیں، اس لئے کچھ بڑھیا کی گت بنا رہی ہیں۔ وہ ہوتیں تو مجال نہیں یوں میرے منہ پر جوتیاں مارتیں۔"

بوبو بھنبھناتی ہوئیں اٹھ کھڑی ہوتیں۔

"کتنا اچھلتا ہے باجی؟" بجمن اس کے چاندی جیسے تنے ہوئے پیٹ پر ہتھیلیاں رکھے قدرت کی ہنگامہ آرائیوں پر متحیر ہو رہے تھے۔

"اتنی ٹھنڈی کیوں پڑ گئی لیمو۔" بہت پیار آتا تو بجمن میاں حلیمہ سے لیمہ اور لیمہ سے لیمو کہتے۔

بجمن نے اسے رضائی میں سمیٹ لیا اور لمبی لمبی سانسیں بھر کر سونگھنے لگے۔ کیسی مہکتی ہے لیمو جسے پکا ہوا دسہری، جی نہیں بھرتا، پانی کا چھلکتا کٹورہ روز پیو، روز پیاس تازہ، مگر اتنا پیار کرنا خود غرضی ہے۔ مرجھائی جاتی ہے۔ نہیں اب وہ اسے ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔ اے وقت یہیں ٹھہر جا، نہ پیچھے مڑ کر دیکھ، نہ آگے نظر ڈال کر پیچھے چھوٹا اندھیرا ہے اور آگے؟ آگے کیا بھروسہ ہے۔

"غضب خدا کا حلیمہ نے کیسی دغا دی ہے۔" بیگم نے نواسی کے منہ میں شہد میں انگلی ڈبو کر دے دی۔ "نایاب تمہارا منہ ہے کہ نگوڑا بھاڑ کہتی تھیں دونوں ساتھ جنیں گی۔ نجم دھاروں دار رد رہی ہیں۔ بچی کو دودھ چھوانے کی روادار نہیں اور تمہاری حلیمہ ہے کہ بچہ نہیں جن پاتی۔ تم تو کہتی تھیں کہ حلیمہ کا بچہ گاؤں بھجوا کر نجم کے بچے کو اس کے سپرد کر دو گی۔ اب کیا ہو گا۔"

نایاب کی بات نہ ٹلے۔ چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے۔ وہ ٹکے کی باندی حلیمہ کی یہ مجال کہ سارا پروگرام چوپٹ کئے دیتی ہے۔

حلیمہ بیٹھی نارنگیوں کا رس نکال رہی تھی۔ ابھی چھوٹے سرکار میچ جیت کر آتے ہوں گے۔ بوبو اسے گھور رہی تھیں جیسے چیل جھپٹا مارنے سے پہلے اپنے شکار کو تاکتی ہے۔ آج بڑی برہم نظر آ رہی تھیں۔

"حلیمہ ادھر آ۔" انہوں نے کرخت آواز میں پکارا۔ حلیمہ تھرا اٹھی۔

"ہوں تو یہ گل کھلایا ہے۔" انہوں نے اس کو سر سے پیر تک گھورا۔ "بول حرام خور یہ کس کا ہے؟" جیسے انہوں نے آج پہلی بار اس کا پیٹ دیکھا ہو۔

"یہ ----- یہ نارنگی ---"

"نارنگی نہیں، نامراد یہ تربوز۔" انہوں نے اس کے اُڈے ہوئے پیٹ پر پنکھیا سے چھپاکا مارا۔ حلیمہ دم بخود رہ گئی۔ آج تک کسی نے اس کے پیٹ کے قطر پر کوئی بات چیت نہیں کی تھی۔ وہ گنگ بس آنکھیں پھاڑے سن رہ گئی۔

"اب بولتی ہے کہ لگاؤں ایک جوتی اس تھوبرے پر، حرامزادی قطامہ۔"

منجھلی نواب کی باندی گوری بی سے جب نایاب نے یہی سوال کیا تھا تو اس نے پھٹ سے جواب دے دیا تھا۔

حلیمہ کی زبان تالو سے چمٹ گئی۔ کوئی اس کی بوٹیاں کر ڈالتا۔ وہ چھوٹے سرکار کا نام نہ لیتی۔ ان کا گناہ تو اس کا سب سے پیارا ثواب تھا۔

"منہ سے پھوٹتی کیوں نہیں جنم جلی؟" انہوں نے چٹاخ سے دیا ایک تھپڑ کہ انگوٹھی گال میں چبھ گئی اور خون نکل آیا۔

بجھمن میاں ہٹ پر ہٹ لگا رہے تھے۔ سارا میدان تالیوں سے گونج رہا تھا۔ تالیوں کے شور میں بجھمن نے چاندی کا کپ دونوں ہاتھوں سے سنبھالا تو ایسا لگا حلیمہ کا چکنا رو پہلی پیٹ دھڑک رہا ہے۔

حسب عادت بجھمن میاں بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ حلیمہ کو پکارا، جواب نہ پایا تو کپ لئے پسینے میں تر پیاری امی کے پاس دوڑ پڑے۔

"اے میاں یہ لوٹا کہاں سے اٹھا لائے اچھا خوبصورت ہے۔"

"یہ لوٹا نہیں بوبو، کپ ہے۔"

"اے بیٹے جان، ذرا حکیم صاحب کو فون کرو کہ ٹانگوں میں پھر سے اینٹھیں شروع ہو گئی ہے۔" پیاری امی کراہنے لگیں۔

جی بہت اچھا۔ بوبو، حلیمہ سے کہو بڑی گرمی ہے، سوتی کرتا نکالے۔"

ٹیلی فون کر کے واپس لوٹے تو بوبو نے اشارے سے کہا سو رہی ہیں۔
"میرے کپڑے؟" بوبو نے اشارے سے اطمینان دلایا۔
"حلیمہ کہاں ہے۔" وہ نہا کر نکلے تو سروری پاجامے میں آزاربند ڈال رہی تھی۔
"ہم پوچھتے ہیں حلیمہ کہاں ہے اور تو بکواس کیئے جا رہی ہے۔" چھمن غرائے۔
"اللہ ہمیں کیا معلوم۔ شاگرد پیشے میں ہوگی۔" سروری آج بڑی بنی ٹھنی آ رہی تھی۔
"شاگرد پیشے میں؟ جا بلا۔" انہوں نے پاجامہ اس سے چھین لیا۔
سروری مسکرائی اور میلے کرتے سے بٹن نکال کر اجلے میں ڈالنے لگی۔
"ارے سنا نہیں تو نے چڑیل، چل بھاگ کے جا۔" انہوں نے اس سے کرتا چھین کر پھینک دیا۔
"بوبو نے ہمیں بھیجا ہے۔"
"تجھے بھیجا ہے؟ کیوں؟" سروری آنکھیں جھکائے ہنس دی۔
"الو کی پٹھی!" چھمن نے ریکٹ لتارا۔ سروری بڑے ناز سے ٹھمکتی جھانجن بجاتی چلی گئی۔
پانچ پھر دس منٹ گزر گئے۔ چھمن جھلائے تولیہ باندھے میگزین الٹ پلٹ کرتے رہے۔ جب پندرہ منٹ گزر گئے تو بے قرار ہو گئے۔
"ارے ہے کوئی؟" وہ حلیمہ کو اسی طرح آواز دیتے تھے۔
سروری اتراتی زمین پر ایڑیاں مارتی، پھر نازل ہو گئی۔ اس کی زہریلی مسکراہٹ دیکھ کر چھمن کا جی دھک سے رہ گیا۔
"چڑیل سچ سچ بتا، نہیں تو۔" انہوں نے اس کی چٹیا کلائی پر لپیٹ کر مروڑی۔
"ہئی میں مر گئی، ہائے میری حمیا، سرکار ادھر شاگرد پیشے میں ہے۔"
چھمن نے اس کی چٹیا چھوڑ دی اور سارے بدن سے کانپنے لگے۔ جلدی سے سلیپر پیر میں ڈالے اور بھاگے۔

"اے میاں خدا کا واسطہ' کہاں جارہے ہیں۔ سروری پیچھے لپکی۔ "مردوں کے جانے کا وقت نہیں ہے۔" مگر میاں کہاں سنتے تھے۔ برآمدے میں نایاب مل گئی۔

"بوبو' ڈاکٹرنی کو فون کراؤ۔"

"ہے ہے چھوٹے میاں کپڑے تو پہنو' اومالزادی۔" انہوں نے سروری کو پھٹکارا۔ وہ تو لطیفہ کو بھیج رہی تھیں پر سروری نے ان کے پیر پکڑ لئے۔

"بوبو جبار کو موٹر لے کر بھیج دو' ٹیلی فون سے کام نہیں چلے گا۔"

"اے میاں' کاہے کے لئے؟"

"حلیمہ"۔۔۔۔۔ ان کا حلق سوکھ گیا۔۔۔۔۔" حلیمہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔"

ڈاکٹرنی نہیں' اس کے لئے تو ولایت سے میم آئے گی۔ بے حیا مردار' لونڈیوں' باندیوں کا دماغ ساتویں آسمان پر چڑھنے لگا ہے۔ ان باتوں سے۔ جایئے آپ کے دوست نعیم میاں کا فون آیا ہے ان کی سالگرہ ہے۔ اور سروری کی بچی نامراد' میاں کا وہ چوڑی دار پاجامہ نکال اور شیروانی۔" وہ چلنے لگیں۔

بوبو' حلیمہ۔"

اے میاں کیا کہنے آئی تھی' آپ نے بالکل ہی بھلا دیا۔ آپ کی پیاری امی کی طبعیت ناساز ہے۔ نعیم میاں کے جاتے وقت ذرا حکیم صاحب کے بھی ہوتے جایئے گا۔ میں جبار سے کہتی ہوں موٹر نکالے۔" وہ دھم دھم کرتی چلی گئیں۔

چھمن بوکھلائے ہوئے کمرے میں لوٹ آئے بیٹھے' پھر تڑپ کر اٹھ کھڑے ہوئے' پھر جلدی سے الٹے سیدھے کپڑے بدن پر ڈالے۔ انہوں نے کتنی باندیوں کی موت دیکھی تھی۔ صنوبر کی لاش مہینوں انہیں خوابوں میں نظر آتی رہی تھی۔ حلیمہ بھی تو پھول سی بچی تھی۔ خون کی کمی کی وجہ سے دق کی مریضہ لگتی تھی۔ وہ سیدھے بڑے بھائی کی طرف بھاگے۔

"بھائی جان۔"

"کیا ہے؟" وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے۔

"وہ' وہ----- ذرا آپ سے ایک بات کہنا ہے۔" انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے ان کی آستین کھینچی۔

"ٹھہرو میاں ذرا یہ بازی دیکھو' کیا ٹھاٹھ جمایا ہے' اے بھائی قدوس شہہ بچئے ورنہ۔"

"بھائی جان۔" بجھمن کا دم نکلنے لگا۔

بیٹھو ذرا' ہاں بھائی قدوس۔"

کوئی بیس منٹ لگے' مگر بجھمن پر نہیں صدیاں گزر گئیں۔

"ارے ہاں بھئی کپ مار دیا تم نے' مبارک ہو۔" انہوں نے پلٹ کر بڑے جوش سے کہا۔

"بھائی جان حلیمہ۔ وہ----- وہ----- پلیز ڈاکٹرنی منگوا دیجئے۔"

"ہوں۔ آجائے گی اگر کوئی ضرورت پڑی تو-----"

"نہیں بھائی جان حلیمہ مرجائے گی۔ کچھ کیجئے۔"

"تو کیا میں خدا ہوں۔ جو کسی کی آئی کو ٹال دوں گا' مگر شرم نہیں آتی ایک باندی کے لئے بڑبڑائے پھر رہے ہو' کچھ تو لحاظ کرو' ایک آوارہ چھوکری کو سر پر چڑھانا ٹھیک نہیں۔ حرامی پلا جن رہی ہے آوارہ نہیں تو بڑی پارسا ہے۔"

"بھائی جان۔ وہ----- وہ۔"

اماں اتنا ہکلاتے کیوں ہو' نکاح نہیں تو عورت فاحشہ ہے' زانیہ ہے' سنگسار کرنے کے قابل ہے' مرجائے تو اچھا ہے۔ خس کم جہاں پاک۔"

"مگر میں بھی تو گناہ گار ہوں۔"

"تو میں کیا کروں' جاؤ اپنے گناہوں کی توبہ کرو۔ میرا سر کیوں چاٹ رہے ہو۔"

اس قدر کوڑھ مغز انسان سے بات کرنا حماقت تھی۔ کوئی اور ہوتا ان کی جگہ تو بجھمن منہ توڑ دیتے' مگر بچپن سے بڑے بھائی کی عزت کرنے کی کچھ ایسی

عادت پڑ گئی تھی کہ خون کے سے گھونٹ پی کر گردن لٹکائے چلے آئے۔

دیوانوں کی طرح جھمن نے ہر چوکھٹ پر ٹھا ٹچا۔ باپ کے سامنے گڑگڑائے' مگر انہیں گل بہار نامراد نے ایسا جلا کر خاک کیا تھا کہ باندی کے نام سے ہی تین فٹ اچھل پڑے۔

تمہاری یہ مجال کہ ہمارے سامنے اپنی بدکاریوں کا اس ڈھٹائی سے اقرار کرو۔ ایک تو موری میں منہ دیتے ہو' پھر اس میں سارے خاندان کو لتھیڑنا چاہتے ہو۔"

انہوں نے پیاری امی کے تلوؤں پر آنکھیں ملیں' مگر انہوں نے ہسٹریا کا دورہ ڈال لیا۔ ایسی بات سننے سے پہلے وہ بہری کیوں نہ ہو گئیں۔ اندھی ہو گئی ہوتیں تو یہ دن تو دیکھنا نہ پڑتا۔

چچا ابا کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

لاحول ولا قوۃ! اماں مرنے دو سالی کو' ہم تمہیں اپنی ماہ رخ دیدیں گے۔ واللہ کیا پٹاخہ ہے ایک چمرخ سی باندی کے پیچھے دم دیئے دے رہے ہو۔ یہ سب تمہاری ان واہیات کتابوں کی خرافات ہے۔"

لوگ مسکرا رہے تھے۔ ان پر لطیفے چھوڑ رہے تھے اور وہ شاگرد پیشے کے آگے سرد اور سیلی زمین پر بیٹھے رو رہے تھے۔ اٹھارہ برس کا لڑکا دودھ پیتے بچوں کی طرح مچل رہا تھا۔ دھاروں دھاروں رو رہا تھا۔

ابا حضور غصے سے گرج رہے تھے۔ اگر بیگم نے دورہ نہ ڈال لیا ہوتا' تو وہ اس ننگ خاندان کی ہنٹر سے کھال ادھیڑ دیتے۔ جس دن انہوں نے سنا تھا کہ فرزند ارجمند نے لونڈی ٹھکانے لگا دی تو ان کی گچھے دار مونچھیں مسکراہٹ کے بوجھ تلے لرز اٹھی تھیں۔ بڑے صاجزادے تو دغا دے ہی گئے۔ اگر چھوٹے بھی اسی راہ نکل گئے ہوتے تو جائیداد کا وارث کہاں سے آتا؟

ایسا تماشا لوگوں نے کبھی نہ دیکھا نہ سنا' نوکر ہنس رہے تھے' باندیاں ٹھٹھی کر رہی تھیں۔

ادھر بان کے جھلنگے میں پڑی حلیمہ مورنی کی طرح کوک رہی تھی کھرے پھانسو دار بان سے اس کی ہتھیلیاں چھل گئی تھیں۔

"ہائے سروری' وہ فرش پر بیٹھے ہیں۔ اٹھا وہاں سے جنم جلی۔ سردی لگ جائے گی ان کے دشمنوں کو۔" اگر درد کے بے رحم حملے اسے وقفہ دیتے تو وہ انہیں اپنے سر کی قسم دے کر زمین سے اٹھا لیتی۔ نہیں قسم خدا کی' ان سے کوئی شکایت نہیں۔

مگر دردوں کی مہیب موجیں اس کے پسینے میں ڈوبے بے ڈول جسم کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ اس نے اپنے ہونٹ چبا ڈالے کہ اس کی آواز سن کر بجمن میاں دیوانے نہ ہو جائیں۔ پر دل کے کان سب سن لیتے ہیں۔ بجمن پر نزع کی کیفیت طاری تھی جی چاہ رہا تھا کہ پتھر پر سر دے ماریں۔ کہ یہ کھولن پاش پاش ہو جائے۔ اچانک دور سے کسی نے ایک دم پکارا۔ غم و اندوہ کے گہرے کنویں سے انہیں اوپر کھینچ لیا۔ انہوں نے پورٹیکو سے سائیکل اٹھائی اور ویسے ہی کیچڑ میں لت پت تیزی سے پھاٹک سے بال بال بچتے ہوئے نکل گئے۔

"ہائے میرا لال۔" بیگم نے ہوش میں آکر چھاتی پیٹ لی۔

"اے ہے بجمن خیر تو ہے۔"

کیچڑ میں سر سے پیر تک نہائے آنسو کے دریا بہاتے بجمن ہچکیوں سے نڈھال رو رہے تھے۔

"حلیمہ ------ پھپو۔"

اچھی تو ہے۔"

"مر گئی۔ مر رہی ہے ------ پھپھو ------ کوئی نہیں سنتا۔"

"بھئی بڑے بے وقوف ہو' میں نے تم سے کہا تھا مجھے فورا. اطلاع کرنا' میں ابھی فون کرتی ہوں ایمبولینس کے لئے ہسپتال پہنچا دیا جائے۔ وہاں محل میں تمہارے بڑوں سے کون لڑے جاکر۔"

"میں کرتا ہوں۔" اشرف ان کے شوہر نے فون اٹھایا۔

"میرا آج فائنل تھا' پھپو' وہاں سے آیا تو---- پتہ چلا' پھپو' مرجائے گی' مر بھی گئی ہوگی' اب تک تو۔"

"نہیں بھائی مرے ورے گی نہیں۔"

جب فرخندہ نواب کی موٹر آگے اور پیچھے ایمبولینس پہنچی تو محل میں کہرام مچ گیا۔ بیگم نے فی البدیہہ ایک عدد دورہ ڈالا اور لب دم ہو گئیں۔ نواب صاحب نے رائفل میں کارتوس ڈالے اور پھنپھناتے ہوئے نکل پڑے۔ مگر ایمبولینس کے پیچھے پولیس کی جیپ نظر آئی تو پلٹ پڑے۔ خاندان کی ایسی تھڑی تھڑی تو جب بھی نہیں ہوئی تھی۔ جب منجھلے نواب کی جاگیر کورٹ ہوئی تھی۔

فرخندہ نواب نے ادھر دیکھا نہ ادھر' سیدھی کال کوٹھڑی میں دندناتی گھس گئیں۔

بجمن نے خون میں نہائی باندی حلیمہ کو بانہوں میں سمیٹ لیا اور محل میں صف ماتم بچھ گئی۔ بیگم کی بے ہوشی جاکر لبوں پر کوسنے آگئے۔

اگلے روز ایک قلم کی جنبش سے بجمن اپنے حق سے دست بردار ہوگئے۔ کون سی گاڑھے پسینے کی کمائی تھی جو درد ہوتا۔ جواباً حضور نے فرمایا۔ انہوں نے بے دریغ دستخط کر دیئے اور جائیداد سے عاق قرار پاگئے۔

بجمن اب ایک چھوٹی سی گلی میں ایک سڑیل سے مکان میں رہتے ہیں۔ کسی سکول میں گیند بلا سکھاتے ہیں۔ کالج بھی جاتے ہیں۔ سائیکل کے کیریر پر سودا سلف کے درمیان کبھی کبھی شربتی آنکھوں والا ایک بچہ بھی بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ تو گئے خاندان سے۔ اتنا پڑھ لکھ کر گنوایا۔ ایک باندی گھر میں ڈال رکھی ہے۔ پتہ نہیں باندی سے نکاح بھی کیا ہے کہ نہیں۔ اللہ اللہ کیسے برے دن آئے ہیں۔

عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح؛ پیچ اور دشوار گزار نظر آتے ہیں۔ مجھے یہ افسانے اس جوہر سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں جو عورت میں ہے۔ اس کی روح میں ہے۔ اس کے دل میں ہے۔ اس کے ظاہر میں ہے' اس کے باطن میں ہے۔

(کرشن چندر)

عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعث فخر ہے۔ انہوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیے ہیں۔ کہ جب تک وہ کھڑی تھیں' کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے اردو ادب میں جو امتیاز عصمت چغتائی کو حاصل ہے' اس کا منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہو گا۔

(پطرس بخاری)

RHOTAS BOOKS

Ahmed Chambers 5 Temple Road Lahore